U19918, Date- 15-12-09 H.

Title - ALIGARH KI TALEEMI TEHREEK.

Creator - Khwaja Ghulamul Sayyeden.

Publisher - (Aligarh) Aligarh Muslim University.

Date - 1931

Pages - 42

Subject - Taleem; Aligarh Tehreek.

علی گڑھ کی تعلیمی تحریک

از

خواجہ غلام السیّدین بی اے۔ایم۔ای۔ڈی،
پروفیسر تعلیمات و پرنسپل ٹریننگ کالج
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۱۹۳۱ء

انتساب

میں اس مضمون کو

اپنے محترم بزرگ اور وائس چانسلر عالی جناب ڈاکٹر سید راس مسعود صاحب

کی خدمت میں

ادب اور خلوص کے جذبات کے ساتھ پیش کرتا ہوں کہ ان کے ہاتھ میں اس وقت اس تحریک کی سرکردگی ہے اور ان کی ذات کے ساتھ وہ توقعات وابستہ ہیں جو مسلمانوں کو اس تعلیم گاہ سے ہیں۔

کیا عجب ہے کہ ان کا جو نصب العین اس تعلیم گاہ کے متعلق ہے اس کی ترجمانی ایک حد تک اقبال کے مندرجۂ ذیل اشعار کر سکیں:

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد — دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوب روئے — تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے — سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد
بہ نگاہِ ناشکیبے، بہ دلِ امیدوارے

خواجہ غلام السیدین

تمہید

یہ مضمون عالی جناب ڈاکٹر سید راس مسعود صاحب وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی آنریری سکریٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی فرمائش اور ایما سے لکھا گیا تھا اور کانفرنس کے اجلاس بنارس منعقدہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں پڑھا گیا تھا۔ اب میں نے اس پر نظرِ ثانی کر کے آخری حصہ میں کسی قدر اضافہ کر دیا ہے اور یہ کانفرنس کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔

"علی گڑھ کی تعلیمی تحریک" ایک نہایت اہم اور وسیع موضوع ہے اور اس پر پوری طرح روشنی ڈالنے کے لئے کم از کم ایک ضخیم کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ مضمون بہت مختصر اور تشنہ ہے اور "زرہِ امتثالِ امر" لکھا گیا ہے۔ میری بڑی خواہش تھی کہ کوئی شخص جو ذاتی طور پر اس تحریک کے تمام مدارج اور تاریخ سے واقف ہو اور تعلیمی مسائل پر نظر رکھتا ہو اس فرضِ تنقیدی کو انجام دے۔ کیونکہ نئی نسلوں کے سامنے اپنے مقاصد اور اعلیٰ نصب العین کو باسلوبِ مناسب پیش کرنا نہ صرف ان کی ہدایت کے لئے ضروری ہے بلکہ نصب العین کو زندہ رکھنے کے لئے بھی لازم ہے لیکن جب ذمہ دار لوگ جو اس کام کی صلاحیت رکھتے ہیں اپنے فرض کو محسوس نہ کریں گے تو اس کا یہی نتیجہ ہوگا کہ مقابلۃً کم صلاحیت رکھنے والے لیکن فرض شناس لوگ اس کو انجام دینے کی کوشش کریں گے خواہ ان کو اس میں کامیابی ہو یا ناکامی۔

لیکن ان کی تسلّی خاطر کے لئے شاعر کا یہ خیال کافی ہے کہ:

"محبت کرنا اور ناکامیاب رہنا اس سے بہتر ہے کہ انسان محبت ہی نہ کرے"

خواجہ غلام السیدین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علی گڑھ کی تعلیمی تحریک

میں کانفرنس کے اراکین کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھ کو یہ موقع دیا کہ میں "علی گڑھ کی تعلیمی تحریک" کے متعلق اپنے خیالات آپ صاحبان کے سامنے پیش کروں مسلمانوں کی مرکزی تعلیمی کانفرنس کا اجلاس اس بحث کے لئے خاص طور پر موزوں ہے کیوں کہ ان دو اداروں میں جو ایک ہی تحریک کے دو مختلف رخ ہیں، ایک گہرا باہمی تعلق ہے جو محتاج بیان نہیں لیکن اگر کانفرنس اور علی گڑھ کی تحریک ایک ہی زبردست دماغ کا نتیجہ نہ ہوتیں اور ایک ہی نصب العین کی کاوش میں نہ پیدا ہوئی ہوتیں اس وقت بھی ہماری اس تعلیمی کانفرنس کے لئے لازم ہوتا کہ وہ اس اہم تعلیمی تحریک کا وقتاً فوقتاً موازنہ کرے

تعلیم قوم کی روحانی جدوجہد اور تحصیل اقدار (VALUES) کا ایک مظہر ہے اور جو اصول اور نصب العین اس کی رہنمائی کے لئے قائم کئے جائیں ان پر ہر زمانہ میں از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ایک طرف تو ہم ان کی صحیح اہمیت اور قدر کو پہچان سکیں اور دوسری طرف یہ دیکھیں کہ وہ اصول جو کچھ عرصہ پیشتر منضبط کئے گئے تھے کس حد تک موجودہ زمانہ کی روش کے لئے مناسب اور موجودہ ضروریات کے کفیل ہیں۔ زندگی کا خاصّہ ہے کہ وہ مسلسل اور پیہم نئی قوتوں کو آشکار کرتی رہتی ہے اور نئے ماحول بناتی رہتی ہے۔ اس کو کسی ایک نقطہ پر قرار نہیں۔ فطرتِ انسانی ایک بے چین جذبۂ تخلیق کے ماتحت ہر وقت پرانے اداروں اور نظاموں میں ترمیم اور تبدیلی کرتی رہتی ہے اور نئے اداروں کی تشکیل اور ترتیب میں کوشاں ہے ؎

چو نظر قرار گیرد بنگارِ خوب روئے　　　تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے

لہذا تعلیم جس کا مقصد انسان کو اس کے ماحول کے ساتھ اور ماحول کو انسان کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہے، اس انقلابِ پیہم سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس لئے ماہرینِ تعلیم کا فرض ہے کہ وہ ہر زمانہ میں پرانے اصولوں اور قدروں کو از سرِ نو جانچیں اور پرکھیں۔ ان میں سے جو اصول ابدی حقائق کے حامل ہیں ان کو قائم رکھیں اور باقی میں حسبِ ضرورت تبدیلی کریں۔ یہی طریقہ ہمیں "علی گڑھ کی تعلیمی تحریک" کے متعلق اختیار کرنا چاہیئے تاکہ ہم اس کی قوّت اور کمزوریوں دونوں سے واقف ہو جائیں اور جوں جوں زمانہ گزرتا جائے اس کو مفید سے مفید تر اور قوی سے قوی تر بنا سکیں۔

اس وقت ہمارے تعلیم یافتہ گروہ میں دو فریق ایسے ہیں جن کے خیالات سے

ہم کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ایک فریق کا نقطۂ نظر علی گڑھ تحریک کے متعلق سراسر معترضانہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ تحریک اپنی فائدہ رسانی کی عمر ختم کر چکی ہے اور اب اس کو بالکل پس پشت ڈال کر قومی تعلیم کے لئے ایک بالکل نئی شاہراہ بنانے کی ضرورت ہے جس کے لئے، ان کے خیال میں، ہمیں ان اصولوں سے کچھ بھی مستعار نہ لینا پڑے گا جو اس تحریک کی بنیاد ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس فریق کی یہ رائے ناواقفیت یا کم فہمی پر مبنی ہے۔ انھوں نے اچھی طرح سے ان اصولوں کو نہیں سمجھا جو اس تحریک کے بانی سرسید احمد خاں نے قوم کے سامنے پیش کئے تھے۔ کیوں کہ جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا ان میں سے بعض اصول ایسے ہیں جن کی اہمیت مستقل ہے اور عام اس سے کہ ہمارا تعلق مسلمانوں کی تعلیم سے ہے یا کسی اور جماعت کی تعلیم سے، وہ اصول قابل توجہ اور قابل عمل ہیں۔ دوسرا فریق ان لوگوں کا ہے جنھوں نے علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کو ایک بت کی طرح پوجنا شروع کر دیا ہے جس طرح خوش عقیدہ پجاری ایک مورتی کے سامنے بیٹھ کر سر دھنتا ہے اور اظہار عقیدت کرتا ہے اور اس کو اس مورتی میں کوئی عیب یا نقص نہیں معلوم ہوتا، اسی طرح یہ گروہ اس تحریک کے بانی اور ابتدائی کارکنوں کی ہر بات اور ہر خیال بلکہ ہر نقطہ اور شوشہ کو منزل من اللہ سمجھتا ہے اور اس میں ہر ترمیم اور تبدیلی کو کفر قرار دیتا ہے۔ یہ لوگ اس بات کے لئے تیار نہیں ہیں کہ دماغی آزادی اور دلیری کے ساتھ اُن خیالات پر غور کریں اور جہاں کہیں مناسب ہو وہاں ضروریاتِ زمانہ کے موافق اصلاح اور ترمیم عمل میں لائیں۔ اس قسم کے نادان دوست ان معترضین سے زیادہ نقصان پہنچا سکتے ہیں جو اعتراض کرتے ہیں لیکن تحریک سے علیحدہ ہیں۔ کیوں کہ یہ تو اصلاح کے راستے میں حائل ہیں۔ یہ نہ صرف

ان چیزوں کی بے سوچے سمجھے حمایت کرتے ہیں جو واقعاً تحریک کا جزو ہیں بلکہ ان جزئیات کو بھی ہاتھ سے دینے کے لئے تیار نہیں جو بعد کے لوگوں نے اپنی عقل سے یا بے عقلی سے اس میں شامل کر دی تھیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ رویّہ سرسید اور علی گڑھ کی تحریک پر احسان نہیں بلکہ سراسر ظلم ہے۔ کیوں کہ سب سے بڑا سبق جو سرسید نے اپنی اس تحریک کے ذریعہ مسلمانوں کو سکھایا ہے وہ یہی ہے کہ ہمیں کسی قدیم اور قائم شدہ نظام کو محض اس لئے تسلیم نہیں کر لینا چاہیئے کہ وہ قدیم ہے قائم شدہ ہے اور ہمارے بزرگوں کی میراث ہے۔ تمام انسانی کوششوں اور کارناموں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا لازم ہے کیوں کہ عقل اور دماغی آزادی سب سے زیادہ قیمتی عطیہ ہے جو مشیت الٰہی نے ہم کو دیا ہے اور اس سے بڑی کوئی نافرمانی نہیں ہو سکتی کہ ہم اس قوّت تنقید کو پس پشت ڈال کر اپنی زندگی کو ہمیشہ کے لئے ایک فرسودہ نظام کا مطیع بنا دیں۔ سرسیّد نے یہ سبق نہ صرف زبانی اور تحریری طور پر سکھایا بلکہ اپنی زندگی کے ہر کارنامے سے اس کو عملاً واضح کیا۔ انھوں نے اس نظامِ تعلیم کو جو مسلمانوں میں صدیوں سے چلا آرہا تھا ناقابلِ قبول سمجھ کر مسترد کر دیا اور اس کے بجائے انگریزی تعلیم کو رائج کرنے کے لئے ایک زبردست تعلیمی جہاد کیا جس میں ان کو ہر قسم کی مشکلات سے سابقہ پڑا۔ انھوں نے قرآن شریف کی تفسیر لکھی ایک نئے علمِ کلام کی بنیاد ڈالی اور بہت سے مسائل میں عام رائے سے اختلاف کر کے نہایت جرأت کے ساتھ اپنے ذاتی خیالات کو ظاہر کیا۔ انھوں نے نظامِ معاشرت میں اسلوبِ تحریر میں اور بہت سے شعبوں میں اپنی زبردست شخصیت کے ذریعہ انقلاب پیدا کر دیا۔ مجھے یہاں ان کے کارناموں کی پوری فہرست سے بحث نہیں۔ میں صرف یہ دکھانا

چاہتا ہوں کہ سرسید اپنی تمام عمر بت شکنی کرتے رہے اور یہ انتہائی ستم ظریفی ہوگی کہ ان کے معتقد اور قدر دان اب خود ان کو بت بنا کر پوجنے لگیں! اگر ان کے لئے اس طرز عمل کے متعلق اظہار خیال کرنا ممکن ہوتا تو وہ سب سے پہلے شخص ہوتے جو اس بت سازی کی مخالفت کرتے۔ سرسید کا مرتبہ بحیثیت ایک مصلح، بحیثیت ایک مدبر تعلیم، بحیثیت ایک زبردست ادیب اور بحیثیت ایک عالم کے اس قدر بلند اور اعلیٰ ہے کہ ان کو نادان دوستوں کی پیر پرستی کی ضرورت نہیں!

(۲)

میں نے علی گڑھ تحریک کے اس دو طرفہ خطرہ کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ میں سے جو صاحبان اس میں واقعی دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس کا ادب انصاف اور دماغی آزادی کے ساتھ مطالعہ کریں اور میں خود اس مضمون میں یہ کوشش کروں گا کہ علی گڑھ تحریک کی اہم خصوصیات کو جو واقعاً قابل قدر ہیں آپ کے سامنے وضاحت کے ساتھ پیش کر دوں اور اس ضمن میں جو تنقید مجھے ضروری معلوم ہو اس سے پہلو تہی نہ کروں۔ جہاں کہیں اس میں کوئی کمزوری کا پہلو ہو اس کی جانب آپ کی توجہ کو مبذول کروں اور اس کے متعلق جو میری رائے ہو اس کو صاف گوئی کے ساتھ ظاہر کر دوں۔ نہ اس وجہ سے کہ میں اس رائے کو قطعی اور مستند سمجھتا ہوں بلکہ اس وجہ سے کہ میرے خیال میں تصویر کا محض ایک رخ دکھانا خلاف دیانت اور خلاف مصلحت ہے۔ علاوہ بریں اگر ایک غلط خیال بھی بحث و مباحثہ اور تبادلۂ آراء کا باعث ہو تو اس کو مفید سمجھنا چاہیئے۔

تحریک کی بڑی بڑی خصوصیات پر نظر ڈالنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ

مختصراً ان حالات کو آپ کے سامنے بیان کردوں جن میں یہ تحریک پیدا ہوئی اور اس نے نشو و نما پائی تاکہ ان خصوصیات کی علت غائی اور مقصد زیادہ واضح ہو جائے اور آپ یہ سمجھ سکیں کہ یہ تمام خصوصیات ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اور قومی زندگی کے نظام سے ان کا ایک مضبوط رشتہ ہے کیوں کہ اگر ہم اس شیرازہ بندی کو نظر میں نہ رکھیں جو ان مختلف اجزا کے درمیان پوشیدہ ہے تو ہم تحریک علی گڑھ کی حقیقی اہمیت اور عظمت کو نہ سمجھ سکیں گے۔ سرسید کے نکتہ رس اور پیش بیں دماغ نے مسلمانوں کی حالت کا بہت غور کے ساتھ مطالعہ کیا تھا اور سب پہلوؤں کو سامنے رکھ کر یہ تعلیمی تحریک جاری کی تھی تاکہ اس کے ذریعے سے وہ تمام مقاصد حاصل ہو سکیں جن کو وہ ضروری خیال کرتے تھے۔ لہٰذا اب میں بہت اختصار کے ساتھ اس تحریک کا پس منظر آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کا نصف اول ہندوستانیوں کے لئے نہایت تاریک زمانہ گزرا ہے۔ کیوں کہ یہ عام طور پر دماغی افلاس اور جمود کا دور تھا اور قوم کی تمام قوتیں اور کاروبار افسردگی کے عالم میں تھے۔ سلطنت مغلیہ کا زوال ہو چکا تھا اور علوم و فنون، صنعت و حرفت، فنون لطیفہ اور فن تعمیر کے دور عروج کے بعد، اب بالعموم لوگوں پر، عام اس سے کہ وہ مسلمان تھے یا ہندو، سستی، غفلت اور جہالت چھائی ہوئی تھی۔ پرانا نظام درہم برہم ہو چکا تھا، پرانی بساط اٹھ چکی تھی، پرانے ادارے ٹوٹ گئے تھے یا ٹوٹ رہے تھے اور نیا نظام ابھی قائم نہیں ہوا تھا۔ قومی زندگی کے ہر شعبے میں بدنظمی اور انتشار کا عالم طاری تھا۔ اس بے سروسامانی کے زمانے میں تمام قوم پر بحیثیت مجموعی ایک سکرات کا عالم طاری تھا جس میں لوگ اپنی کھوئی ہوئی شخصیت اور وقار کو حاصل کرنے کے لئے بالاراده

کوشاں نہیں تھے بلکہ اندھیرے میں چاروں طرف ٹٹول رہے تھے۔ اس حالت میں ایک نیا شگوفہ یہ کھلا کہ ہندوستانیوں کو ایک نئی تہذیب اور تمدن سے دوچار ہونا پڑا جو مغرب کی پیداوار تھی اور ان لوگوں کے ساتھ ساتھ آئی تھی جو اوّلاً تجارت کی غرض سے ہندوستان میں آئے تھے اور اس کے بعد یہاں کے حالات دیکھ حکمرانی کی ہوس میں گرفتار ہو گئے۔ نئی تہذیبوں کے ساتھ اس طرح کا تعلق اور تصادم ہندوستان کی تاریخ میں پہلے بھی ہو چکا تھا اور اکثر اس تعلق کا نتیجہ یہی نکلا تھا کہ نئی اور پرانی تہذیبوں کے ملنے سے ایک جدید تہذیب رونما ہوئی جو بعض لحاظ سے دونوں پر فوقیت رکھتی تھی اور جس نے ان کے قابل قدر عناصر کو اپنی ذات میں جذب کر لیا جس وقت سر سید نے ہندوستان کی ملکی زندگی میں حصّہ لینا شروع کیا مشرق اور مغرب، قدیم اور جدید کا یہ تصادم شروع ہو چکا تھا۔ لیکن لوگوں نے پوری طرح غور و فکر کر کے اس کی جانب کوئی خاص رویّہ اختیار نہیں کیا تھا۔ ابتدا میں تقریباً خود بخود لوگوں کی طبیعت میں یہ ردِّ عمل ہوا کہ انھوں نے اس تہذیب کو کلیۃً مسترد کر دیا اور اس کی جانب سے منھ پھیر لیا۔ جیسا کہ اکثر دماغی افلاس کے زمانہ میں ہوتا ہے، انھوں نے اپنی نظروں کو ماضی کی طرف موڑا اور اس کو عہدِ زرّیں تصور کر کے اس کی مدح سرائی کرنے لگے جس طرح یورپ نے قرونِ متوسطہ کے تاریک دَور میں اپنے دماغ کو قدیم اور فرسودہ خیالات کی دنیا میں محصور کر لیا تھا، اسی طرح اس زمانے میں ہندوستانیوں نے علمی تحقیقات اور نئی دریافتوں کا سلسلہ بالکل منقطع کر دیا اور اپنی تمام دماغی قوّتوں کو قدیم عربی، فارسی اور سنسکرت کتب کی تفسیر اور تفسیر در تفسیر کے لئے وقف کر دیا اور اس ہلاکت آفریں قدامت پرستی کے جواز کے لئے مذہب کی آڑ پکڑنی چاہی۔ بالخصوص مسلمانوں نے اس طریقۂ تعلیم کو جو صدیوں سے رائج تھا

اور جو زیادہ تر قدیم فلسفہ اور علوم اور مذہبی زبانوں کی تحصیل تک محدود تھا مذہب کا جزو بنا لیا حالانکہ اس نظام میں ضروریات زمانہ کے مطابق صدیوں سے کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں ہوئی تھی اور اس میں ان نئے معاشرتی، اقتصادی اور تجربی علوم کے لئے کوئی جگہ نہ تھی جو گزشتہ دو صدیوں سے نہایت تیزی کے ساتھ مغرب میں نشو و نما پا رہے تھے۔ محسن الملک مرحوم اس وقت کے علماء کے نقطۂ نظر کو اس طرح بیان کرتے ہیں :

"ہمارے بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ نقلی علوم قرآن وحدیث میں جمع ہیں اور اس کی تفسیر پچھلے علماء پر ختم ہوگئی۔ فلسفہ اور معقولات کا علم اور تفسیر ارسطو، فارابی اور بو علی پر ختم ہوگیا اور نئی بات نہ علم دین میں نکل سکتی ہے نہ فلسفہ اور حکمت میں، نئے خیالات غلطیاں اور مہملات ہیں "

تحریک علی گڑھ کے بانی اور ان کے شرکائے کار نے اس خطرہ کو محسوس کیا جو ہندوستانیوں کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص درپیش تھا۔ ایک طرف ان کا اپنا تہذیب و تمدن اور علم و تعلیم کا نظام درہم برہم تھا اور بعض لحاظ سے بالکل بعید از کار ہو چکا تھا اور دوسری طرف ایک فاتح قوم کی تہذیب اپنے علوم اور اپنے نظام تعلیم کو ساتھ لئے بڑھتی چلی جاتی تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ اگر مسلمانوں نے اس نئے اور زبردست اثر کی جانب سے غفلت برتی تو ان کو بہت سخت نقصان پہنچے گا۔ اگر حالات سے مجبور ہو کر اور دنیاوی مفاد کے لالچ سے انھوں نے نئے اثرات اور نئی تہذیب کے رطب و یابس کو تمام و کمال قبول کر لیا تو وہ اپنا مذہب اور اپنی تہذیب اور اپنے قومی خصائص بالکل کھو بیٹھیں گے اور یہ اتنا بڑا نقصان ہوگا جس کی تلافی کسی طرح ممکن نہ ہوگی۔ کیوں کہ جب قوم کی انفرادیت

معدوم ہو جائے وہ کوئی بڑا کام انجام نہیں دے سکتی۔ برخلاف اس کے اگر انھوں نے ان اثرات کو قطعاً مسترد کر دیا اور محض قدیم علوم کی تحصیل کی بیجا کوشش میں مصروف اور مطمئن رہے تو وہ نہ صرف ترقی کی دوڑ میں معاصر اقوام سے پیچھے رہ جائیں گے بلکہ ان کی تہذیب اور ان کا مذہب بھی قائم نہ رہ سکے گا کیوں کہ اس تگ و دو اور مقابلہ کے زمانہ میں جو قوم علمی اور اقتصادی لحاظ سے دوسروں سے پست ہو، جس کا دنیاوی وقار معدوم ہو جائے وہ اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کا سکّہ ہرگز نہیں جما سکتی۔ ان کے خیال میں سیاسی اور اقتصادی زوال سے بہت زیادہ خطرناک اور قابل افسوس مسلمانوں کا وہ علمی اور اخلاقی انحطاط تھا جو حیات ملّی کے ہر شعبہ میں ظاہر ہو رہا تھا۔ مسلمانوں کی حالت کو سنبھالنے اور ان کی اصلاح اور ترقی کے ذریعہ اسلام کی حمایت کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ مسلمان دوبارہ علم و تعلیم کی جانب وہی رویّہ اختیار کریں جو پیغمبر اسلام صلعم نے ان کو بتایا اور قرآن نے ان کو سکھایا تھا۔ حکمت جس میں سائنس اور فلسفہ دونوں شامل ہیں۔ حدیث نبوی کے الفاظ میں، مومن کی کھوئی ہوئی پونجی ہے۔ اسے چاہیئے کہ اس کو حاصل کرے۔ جہاں کہیں وہ اس کو پائے۔ الحکمۃ ضالۃ للمؤمن فحیث وجدھا فھو احق بھا

سرسید نے مسلمانوں کو ان کی تاریخ اور مذہب دونوں کی رُو سے دکھایا اور علماء کو بڑی حد تک قائل کیا کہ اسلام نے اپنے عہد عروج میں کبھی علمی تعصب یا تنگ نظری نہیں دکھائی بلکہ مروّجہ علوم سے جو زیادہ تر یونانیوں کی میراث تھے پوری طرح فائدہ اٹھایا اور ان پر عبور حاصل کر کے علم کی عمارت کو جسے مختلف قومیں اور تہذیبیں یکے بعد دیگرے بناتی آئی ہیں اور زیادہ بلند کر دیا۔ انھوں نے دینی اور دنیوی علوم میں کوئی بے جا امتیاز قائم

نہیں کیا۔ "العلم علمان علم الادیان وعلم الابدان" اور جس وقت مسلمانوں کو "طلب علم" کا حکم ہوا تھا اس لفظ علم میں یہ دونوں قسمیں شامل تھیں۔ اسی لئے اپنے عروج کے زمانے میں مسلمانوں نے دونوں کے حصول اور ترقی کی انتہائی کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوئے لیکن بعد کے علمار نے تنگ نظری اختیار کر کے علوم دنیوی کو حقیر یا غیر ضروری قرار دیدیا اور تمام تر توجہ محض فقہ اور حدیث کی کتابوں پر صرف کر دی۔ سر سید نے اس خیال کے خلاف بہت قابلیت سے جہاد کیا اور دین و دنیا کا جو صحیح رشتہ اسلام نے بتایا تھا اس کی یاد اور ذوق کو لوگوں کے دلوں میں تازہ کیا۔ یہ اصول اسلام کے ان اعلیٰ ترین اور امتیازی اصولوں میں سے ہے جن کا یاد دلانا بجائے خود ایک نہایت زبردست دینی خدمت ہے۔ وہ تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں :-

> "عرصے سے مسلمانوں کے دل میں یہ بات سمائی ہے کہ علمی عبادت صرف علوم دینیہ ہی کے پڑھنے پر منحصر ہے اور اس کے سوا اور علم کا پڑھنا، پڑھانا یا اس پر روپیہ خرچ کرنا نہ عبادت ہے نہ ثواب ۔۔۔۔ اس سبب سے مسلمانوں میں روز بروز علم کا تنزل ہے جس کے ساتھ خود علم دین بھی معدوم ہوتا جاتا ہے ۔۔۔ علوم دینیہ کا صرف جاننا نہ کچھ ثواب ہے نہ کچھ عبادت۔ وہ صرف اس وقت ثواب یا عبادت ہو سکتا ہے جب اس کو امور دینی کے کام میں لانے کی نیت سے پڑھا جائے۔ تمام علوم جن کو علوم دنیوی کہتے ہیں واسطے ترقی اور استحکام اور تعلّی علوم دینی کے ضروری ہیں۔ اس نیت سے کہ وہ اس کے لئے بمنزلہ آلہ کے ہیں ان کا پڑھنا بھی عبادت ہے۔"

ایک دوسری جگہ وہ کہتے ہیں :

"تعجب کی بات ہے کہ اس بات کی کوشش کرنا کہ مسلمانوں میں قومی ترقی ہو، علوم دینی قائم رہیں، علوم دنیاوی جو مفید اور بکار آمد ہیں ان کا رواج اور ترقی ہو، لوگ معاش سے فارغ البال ہوں، اکلِ حلال پیدا کرنے کے وسیلے ہاتھ آئیں، حسنِ معاشرت میں جو نقائص ہیں وہ رفع ہوں، جن بد رسموں اور خراب عادتوں سے غیر قومیں مسلمانوں کو اور اسلام کو حقیر و ذلیل سمجھتی ہیں وہ موقوف کی جائیں جو خلاف شرع تعصبات و توہمات ہیں اور ہر طرح کی ترقی کی مانع ہیں وہ دور کیے جائیں۔ ان تمام باتوں کو محض دنیداری اور حبّ قومی سے نہ سمجھنا اور انہاک دنیا کا الزام دینا کس طرح خدا کے نزدیک درست ہوگا۔"

اس بیان سے معلوم ہوگا کہ گزشتہ صدی کے نصف آخر میں علی گڑھ تحریک نے تعلیم کی پہلی بڑی خدمت یہ کی کہ مسلمانوں کو اس امر کا احساس دلایا کہ تعلیم کا تعلق ان کی تمام زندگی سے ہے جس میں دین اور دنیا دونوں شامل ہیں اور کوئی نظام تعلیم تشفی بخش نہیں ہو سکتا جب تک وہ دنیوی ترقی اور دینی فلاح دونوں کا ضامن نہ ہو۔ سرسید نے اس خیال کی ایک دلیل یہ بیان کی کہ:

"خدائے تعالیٰ نے انسان میں وہ تمام قویٰ پیدا کیے ہیں جن سے وہ علم دین اور وہ علوم جن کو دنیاوی علوم کہتے ہیں دونوں کو حاصل کر سکتا ہے۔ پس ان دونوں قوتوں کو ہمیں کام میں لانا چاہیے .. ایک کو شگفتہ و شاداب اور دوسرے کو معطل اور بے کار کرنا قانونِ قدرت کے برخلاف ہے .. البتہ دونوں کو حدِ اعتدال پر رکھنا چاہیے اور ایک کو دوسرے سے مغلوب نہ کرنا چاہیے۔ ہمارا مذہب معاد و معاش دونوں کی اصلاح و ترقی کا ضامن ہے۔"

یہ خیالات تھے جن کو لے کر سرسید اپنی قوم کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ لیکن جہاں اُنھوں نے قدیم تعلیم کی کمزوریوں اور نقائص کو اچھی طرح دیکھا اور محسوس کیا تھا، اسی طرح وہ مغربی تہذیب کی کمزوریوں سے بھی واقف تھے اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ اُس کو تمام و کمال قبول کر لیا جائے اور اپنی تہذیب، تمدن اور مذہب کو اس کی رَو میں بہا دیا جائے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان میں بہت سے قابل قدر عناصر ہیں جن کا تحفظ ضروری ہے اور یہ تحفظ مغربی تعلیم کے مروّجہ نظام کے ذریعہ ممکن نہیں۔ گورنمنٹ نے جو مدرسے اور کالج ہندوستان میں قائم کئے تھے وہ پالیسی کی رو سے مذہبی تعلیم سے بیگانہ تھے۔ ان کا مقصد محض بعض ضروری دنیاوی علوم اور انگریزی زبان کا پڑھانا تھا تاکہ ان پر عبور حاصل کر کے ہندوستانی سرکاری نوکریوں میں شریک ہو سکیں۔ دوسرے اس تعلیم کی بنیاد قومی تمدن اور تہذیب کی پائدار بنیاد پر نہیں تھی بلکہ وہ تقریباً تمام و کمال انگلستان کی مروجہ تعلیم تھی اور اس وجہ سے ملک کی ضروریات اور مقاصد کے حصول میں وہ مدد نہیں دے سکتی تھی۔ لہذا ہندوستانیوں کے لئے یہ تعلیم جو مذہب سے رشتہ نہ رکھتی تھی اور قومی تہذیب سے بیگانہ تھی کافی نہ تھی۔ ایک مسلمان طالب علم کو سوائے اس کے کچھ چارہ نہ تھا کہ وہ یا تو قدیم تعلیم حاصل کرے جو وہ علوم سے کنارہ کشی کرے اور دنیا کے نئے مشاغل اور کاروبار میں ایک عضو معطل ہو کر رہے یا انگریزی تعلیم کی طرف رجوع کرے جو صریحاً تنگ اور محدود معنوں میں افادی تھی۔ علی گڑھ کی تحریک نے مسلمانوں کے سامنے ان دونوں راستوں سے علٰحدہ ایک تیسری شاہراہ پیش کی جس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ "سررشتۂ تعلیم ما در دست ما باشد" یعنی ہم کو چاہئے کہ اپنی تعلیم کے نظام کو اپنی مخصوص ضروریات اور نصب العین کے مطابق تشکیل دیں

اور اس کے ذریعہ قوم میں بیداری اور عملیت کی ایسی روح پھونکیں جو ایک طرف توہمات، غفلت اور قدامت پرستی کی قوتوں کو شکست دے اور دوسری طرف ان طاقتوں کا مقابلہ کرے جو مذہب اور تمدن کو مٹا دینے کی دھمکی دے رہی تھیں۔ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک اس احساس کا نتیجہ تھی اور اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ ہندوستان کے حال کی تاریخ میں قومی تعلیم کا پہلا احساس اور پہلا مطالبہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اپریل ۱۸۹۸ء میں لندن کے اخبار ٹائمز نے لکھا تھا کہ

"سرسید کو مسلمانوں کا تعلیمی پیغمبر کہنا روا ہے"

اس مختصر مضمون کے دوران میں میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ میں علی گڑھ تحریک کی تمام تاریخ اور ارتقا کو بیان کروں اور بتاؤں کہ کس طرح رفتہ رفتہ سرسید اور ان کے رفقائے کار نے اس مخالفت کو دور کیا جو مسلمانوں میں، بالخصوص طبقۂ علماء میں، انگریزی علوم کی ہو رہی تھی۔ در اصل یہ بہت بڑا کارنامہ تھا کیوں کہ مسلمانوں میں اس وقت ایک نئے نظام تعلیم کو رائج کرنا تقریباً اتنا ہی مشکل تھا جتنا کہ ایک نئے مذہب کو رواج دینا۔ کیوں کہ علماء اور عوام دونوں کے نزدیک مروّجہ تعلیم مذہب کا جزو تھی۔ علاوہ بریں حکمراں قوم ہونے کی وجہ سے وہ بالعموم دوسروں کی زبان اور علوم کا تحصیل کرنا ضروری نہ سمجھتے تھے مسلمان علماء بیشک دیگر اقوام کے علوم کی طرف توجہ کرتے تھے لیکن جمہور مسلمین کو اس بات کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ وہ بحیثیت فاتحین کے جہاں کہیں جاتے تھے ان کی زبان اور مذہب وہاں رائج ہو جاتے تھے۔ اس لئے اس تعلیمی جہاد میں نہ صرف قدامت پسندی اور جمود سے جنگ تھی بلکہ نفسی رکاوٹوں اور تعصبات کا دور کرنا بھی ضروری تھا۔ اس جد و جہد میں

جو شاندار کامیابی علی گڑھ تحریک کو ہوئی اس کو مولانا حالی نے اپنی لافانی کتاب حیاتِ جاوید میں اس قدر خوبی اور عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہی کہ اس کو دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ علاوہ بریں اکثر لوگوں کو معلوم ہی کہ اس سلسلہ میں کس طرح تحریک کے لیڈروں کو وقتاً فوقتاً نہ صرف پبلک کے تعصب سے بلکہ گورنمنٹ کی تنگ نظری اور بے جا روک تھام سے جنگ کرنی پڑی اور کس طرح ۱۸۷۵ء کا چھوٹا سا مدرسہ جس میں چند طالب علم تھے مدرسے سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی بن گیا اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور عام بیداری کا باعث ہوا۔

(۳)

اب میں ان اصولوں اور خصوصیات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو اس تعلیمی تحریک کی بنیاد ہیں اور جن کا اعادہ اور تنقید نہ صرف ہمارے لئے مفید ہی بلکہ ہر اُس شخص کے لئے مفید ہی جس کو تعلیم کے مسئلہ سے ذرا بھی دلچسپی ہی۔ کیوں کہ جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں ان میں سے بعض اصولوں کی اہمیت عالمگیر ہے۔ اس ضمن میں یہ یاد رکھنا ضروری ہی کہ سرسید کی امتیازی خصوصیت تعلیم کے میدان میں یہ تھی کہ اُنھوں نے بہت سے خیالات اور تعلیمی اصولوں کو کم از کم اس زمانے میں سب سے پہلے عمل میں لانے کی کوشش کی۔ وہ تعلیمی پیش رو PIONEER تھے ان کے سر ابتدا کرنے کا سہرا ہی۔ یہ اور بات ہی کہ آج ان میں سے بہت سی باتیں ہم کو پیش پا افتادہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہی کہ وہ خیالات اب عام طور پر نظریہ تعلیم کا جزو ہو گئے ہیں اگرچہ ابھی تک عملاً وہ تعلیم کا جزو نہیں ہوئے۔

علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کی ایک امتیازی خصوصیت میں بیان کر چکا ہوں یعنی یہ کہ اس نے سب سے پہلے مسلمانوں میں قومی تعلیم کا احساس اور خواہش پیدا کی۔ اس کی

بنیاد اعتماد نفس اور امداد ذات کے اصول پر تھی۔ اُس نے اس حقیقت کو پیش نظر رکھا کہ کوئی حکومت بحیثیت حکومت کے کسی قوم کی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں کر سکتی اور اس کے لئے مناسب تعلیم مہیا نہیں کر سکتی۔ کیوں کہ تعلیم کا مسئلہ ایک روحانی مسئلہ اور تہذیب نفس کا مسئلہ ہے اس میں جہاں تک سرکاری قیود اور بندشوں اور آزادی کو مسدود کرنے والے قواعد و ضوابط کو دخل دیا جاتا ہے اس کا غنچۂ روح مرجھا کر رہ جاتا ہے۔ خصوصاً ایک غیر قومی حکومت تو کسی طرح بھی اس فرض کی تمام تر ذمہ داری لینے کی اہلیت نہیں رکھتی بے شک حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ تعلیم کے لئے سامان اور وسائل مہیا کرے لیکن اصول اور طریقے اور نصب العین ایسی چیزیں ہیں جو ہر قوم کی مخصوص جوہر طبع (GENIUS) اور ضروریات کی پیداوار ہیں۔ اگر ان کو بھی حکومت کے تابع کر دیا گیا، جیسا کہ مختلف ملکوں کی تاریخوں میں بارہا ہوا ہے تو اس کا نتیجہ قوم کی علمی اور ذہنی ترقی کے لئے بہت بُرا ہوگا۔ تحریک کے بانی نے ایک جگہ غیر قومی یونیورسٹیوں کی ڈگریوں سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کی سی ہے ہم یونیورسٹیوں کے تابع ہیں۔ ان کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں۔ جو ٹکڑا وہ علم کا دیتے ہیں اس کو کھا کر اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں ... ہماری پوری پوری تعلیم اس وقت ہوگی جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی، یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی۔ ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے۔ اور بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس ہمارے بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا تاج ہمارے سر پر ...."

اسی وجہ سے اس تحریک کی کامیابی کے لئے امیر اور غریب مسلمانوں سے بھیک مانگ مانگ کر چندہ کیا گیا اور ایک سرمایہ جمع کیا گیا جس کے ذریعے سے ایک حد تک مسلمان تعلیم کے میدان میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ اس مقصد کے لئے چندہ دینے کی بدولت مسلمانوں کی پبلک عام طور پر اس میں شریک اور متوجہ ہو گئی اور انھوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ ہماری چیز ہی اور اس کی کامیابی میں ہماری کامیابی ہے اور کم از کم ابتدائی دور میں یہ تعلیم گاہ کبھی چند افراد کے ہاتھوں میں آکر محض ایک ذاتی چیز نہیں بنی۔ بلکہ تمام قوم کی متفقہ کوشش کا مرکز رہی جیسا کہ ۱۸۸۲ء کے تعلیمی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہی:

"انگریزی حکومت کے آغاز سے آج تک یہ مسلمانوں کی امداد خویش کا پہلا اظہار ہے۔ علی گڑھ کی پارٹی نے ملک کے سامنے ایک ایسی مثال قائم کر دی ہے کہ اگر اسی کی صحیح پیروی کی جائے تو قومی تعلیم کا مسئلہ حل ہو جائے ..." اور "ملک میں ایسے کمیشنوں کی ضرورت نہ رہے"

ابتدائے تحریک سے آج تک یونیورسٹی کے اعلیٰ ارکین کی یہ خواہش رہی ہے کہ اتنا سرمایہ جمع کر لیا جائے جو ان کو گورنمنٹ کی امداد سے جو نہایت سخت شرائط سے مشروط ہوتی ہے اور پبلک کے ناقابل وثوق چندوں سے بے نیاز کر دے تاکہ ان کو صحیح معنوں میں تعلیمی آزادی حاصل ہو اور وہ واقعاً ایک قومی یونیورسٹی بن جائے۔ سید محمود نے جو اسکیم یونیورسٹی کی گورنمنٹ کے سامنے پیش کی تھی اس کی پہلی دو شقیں ایسی تھیں جن سے ان کی انتہائی دور بینی اور نکتہ رسی کا پتا چلتا ہے۔ ہماری یونیورسٹی کے موجودہ

وائس چانسلر صاحب نے جو خوش قسمتی سے اس سال کانفرنس کے صدر ہیں، حال ہی میں نہایت زور کے ساتھ مسلمانوں سے اپیل کیا ہے کہ وہ یونیورسٹی کے سرمایہ کو چالیس لاکھ سے ایک کروڑ تک پہنچا دیں۔ دیکھنا ہے کہ اس نہایت اہم اور ضروری اپیل کو قوم کس حد تک لبیک کہتی ہے۔ اس اپیل کی صحیح اہمیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس سے صرف یہی مقصد نہیں کہ اگر روپیہ زیادہ ہوگا تو ہم صنعت و حرفت وغیرہ کے وہ شعبے کھول سکیں گے جن کی نہایت سخت ضرورت ہے۔ وہ بھی بجائے خود ایک بہت اہم اور مفید کام ہے لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ اہم اور قابل قدر وہ علمی اور ذہنی آزادی ہے جس کے بغیر ہم یونیورسٹی کے اعلیٰ ترین مقاصد کو کبھی حاصل نہیں کر سکتے اور جو اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہم اپنی گزران کے لئے گورنمنٹ کے دست نگر ہیں۔ یونیورسٹی کا اپنی ترقی اور حصول مقاصد کے لئے مستقلاً حکومت یا دیگر صاحبانِ ثروت کا محتاج ہونا اس کی روحانی زندگی اور آزادی کی راہ میں حائل ہے اور جب تک یہ رکاوٹ موجود ہے ہم بانیِ تحریک کے اعلیٰ مطمحِ نظر تک نہیں پہنچ سکتے۔ دولت اور ثروت کو علم اور روح کا حاکم بنانا اخلاقی اور روحانی خودکشی ہے۔ ان کی حیثیت نہایت ضروری اور مفید خادموں کی ہے اور بس!

(۲) دوسری خصوصیت علی گڑھ تحریک کی یہ تھی کہ اس نے مشرقی تہذیب اور مغربی تمدن اور علوم میں امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی۔ سرسید کا یہ عقیدہ تھا اور بالکل درست عقیدہ تھا کہ ہندوستانیوں کے دماغ اور ذہنیت اور ہندوستانی تہذیب میں قدرت نے یہ قوت دی ہے کہ وہ نئی اور بیرونی تہذیبوں کو اپنے میں جذب کر سکتے ہیں اور ان کے تہذیب و تمدن کی ترقی اسی طرح ہوتی ہے کہ اس بحرِ ذخار میں بہت سی چھوٹی چھوٹی اور بڑی ندیاں آ کر

مل جاتی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے آریوں کی تہذیب، پٹھانوں کی تہذیب، مغلوں کی تہذیب ایک ایک کرکے ہندوستان میں آئیں اور باہم گرمل جل گئیں۔ لہٰذا ہندوستانیوں کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ مغربی تمدن اور علوم کو تمام وکمال مسترد کردیں۔ بالخصوص مسلمانوں کا تعصب جدید علوم کے خلاف عقلاً مہمل اور مذہباً ناجائز ہے کیوں کہ انھوں نے اپنے زمانہ ماضی میں جو علمی ترقیاں کی تھیں وہ اس طرح ظہور میں آئی تھیں کہ پہلے انھوں نے مروّجہ علوم کو حاصل کیا، خواہ ان کا سرچشمہ کہیں بھی ہو۔ اس کے بعد ان علوم میں اور زیادہ ترقی کی۔ لہٰذا ان کا فرض ہے کہ وہ پوری طرح ان علوم وفنون سے فائدہ اٹھائیں جو مسلمانوں کے علمی زوال کے بعد مغرب کی سرزمین میں نشو ونما پاتے رہے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کو یہ بھی احساس تھا کہ مغرب کے بعض اثرات محض مخرّب اور تباہ کن ہیں جن سے نوجوانوں کو محفوظ رکھنا ضروری ہے اور قدیم تہذیب وتمدن میں بہت سے ایسے قابل قدر عناصر ہیں جن کا تحفظ لازمی ہے تاکہ وہ تعلیم جدید کے مضر اثرات کو روکیں اور نوجوانوں کی طبیعت میں ایک توازن سلیم پیدا کریں۔ اس لئے ان کی اسکیم میں ایک طرف یہ گنجائش تھی کہ علوم مغرب کے عالم اور ماہر طلباء کو معاشرتی اور اقتصادی علوم اور علوم فطرت کی تعلیم دیں اور دوسری طرف مستشرقین اور ماہرین علوم قدیمہ اپنے علوم اور السنہ سکھائیں لیکن ان کے خیال میں محض یہ بات کافی نہ تھی کہ علی گڑھ کالج میں دو بالکل مختلف شعبے کھولے جائیں ایک علوم مشرقی کا، دوسرا علوم مغربی کا جن میں کوئی باہمی ربط نہ ہو۔ اس سے ملک کی ذہنی زندگی کو کوئی بڑا فائدہ نہ پہنچ سکتا۔ صرف عملی فرق اتنا ہوتا کہ دو مختلف قسم کی تعلیم گاہوں کا کام ایک ہی چار دیواری میں انجام پاتا۔ اس تحریک کا دراصل یہ منشا تھا کہ ان دونوں شعبوں میں

ایسا اتحادِ عمل اور باہمی رابطہ پیدا کیا جائے جس سے دونوں مستفید ہوں مشرقی علوم میں مغرب کے تنقید اور تبصرہ اور مشاہدہ اور تجربہ کے اصولوں کے ذریعہ سے نئی روح پھونکی جائے ان میں جو جواہرات بھرے پڑے ہیں لیکن کان کنی نہ کرنے کی وجہ سے قدر شناس علمی دنیا سے پوشیدہ ہیں ان کو اس تعلیم گاہ کے معلّم دنیا کے سامنے پیش کریں اور یہی تعلیم گاہ اپنی تہذیب و تمدن کے بنیادی اصولوں کے مطابق مغرب کی تہذیب و تمدن کو پرکھے، کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرے اور ملک کی اس مسئلہ میں رہنمائی کرے کہ ان میں سے کیا چیزیں قابل قبول ہیں اور کیا چیزیں مسترد کرنی چاہیئیں۔ تحلیل و ترکیب کا یہ دوطرفہ فرض علی گڑھ کے ذمہ تھا لیکن اس کو اس فرض کی ادائگی میں بہت ہی جزوی کامیابی ہوئی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ سرسید اور مولانا حالی اور تاریخ کے میدان میں ایک حد تک مولانا شبلی کے سوا اس تحریک کے علمبرداروں میں سے کسی نے یہ خدمت انجام نہیں دی کہ مغرب کے علمی اصولوں سے فائدہ اٹھا کر اس بصیرت کو خود اپنے علوم کی تدوین، ترقی اور تنقید میں استعمال کریں اور یہ لوگ بھی علی گڑھ کی پیداوار نہ تھے اس تحریک کے سرگروہوں میں سے تھے۔ لہذا علی گڑھ پر یہ الزام قائم ہے کہ اس نے مشرقی اور ملکی علوم کی کماحقہ خدمت نہیں کی۔ یہاں تک کہ اب تک اُردو کو اپنے نصاب میں وہ جگہ نہیں دی جو مادری زبان اور اس ادب کے شایانِ شان ہے حالانکہ اُردو کا جو نیا اسکول گزشتہ صدی میں پیدا ہوا اور جس نے اس کو ایک زبردست علمی زبان بنا دیا اس کے سب لوگ ابتدا میں علی گڑھ سے تعلق رکھتے تھے۔

(3) علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کا تیسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ملک کے نظام تعلیم میں مذہب اور مذہبی تعلیم کی اہمیت کو پہچانا اور پہچنوایا۔ یہاں یہ ضروری نہیں کہ میں مذہب کی اہمیت سے

بحث کروں یا یہ بتاؤں کہ لوگوں کی زندگی کی تشکیل میں اس نے کس قدر زبردست حصّہ لیا ہے۔ یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ کوئی نظام تعلیم قوموں کی زندگی میں انقلابِ عظیم پیدا نہیں کر سکتا اور ان کی روحانی قوّت کو بیدار نہیں کر سکتا جس کی بنیاد مذہب پر قائم نہ ہو۔ مذہب سے یہاں میری مراد وہ رسوم اور قواعد اور عبادات نہیں جن پر ضرورت سے زیادہ اصرار کرنا روحانی موت کا باعث ہوتا ہے بلکہ اس سے حقیقی مذہبی روح مفہوم ہے جو لوگوں کے دلوں میں ادب، عقیدت اور خلوص پیدا کرتی ہے اور ان کا رشتہ نظام کائنات اور خالقِ کائنات سے ملاتی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے ہمیشہ تعلیم اور مذہب کے گہرے تعلق کو تسلیم کیا ہے یہاں تک کہ جیسا میں نے اوپر بیان کیا ان کی تعلیم مذہب کا جزو سمجھی جانے لگی تھی۔ جب انگریزی تعلیم ملک میں جاری ہوئی تو وہ حکومت کی مصلحت اور مجبوریوں کی وجہ سے مذہب سے بالکل الگ تھلگ رہی اور مذہبی غیر جانب داری اس کی ایک خصوصیت قرار پائی۔ لیکن عملاً اس غیر جانب داری کا یہی نتیجہ ہوا کہ جو طلبا ان مدارس میں تعلیم پاتے تھے وہ مذہب سے بالکل بیگانہ اور بے پروا ہو جاتے تھے۔ سرسید نے اس خطرہ کو محسوس کیا اور چوں کہ مسلمانوں میں مغربی علوم اور انگریزی تعلیم کی اشاعت ان کی کوششوں سے ہو رہی تھی۔ اس لئے انھوں نے خاص طور پر اس ذمہ داری کو اپنے اوپر لیا کہ تعلیم طلبا کو مذہب سے منحرف نہ کر دے اور اپنی تعلیمی اسکیم میں انھوں نے مذہبی تعلیم کو ایک لازمی جزو قرار دیا۔ سید محمود اپنی معرکۃ الآرا کتاب "ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی تاریخ" میں سرکاری مدارس کے اس نقص سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"(تعلیم میں) اس قسم کی مذہبی غیر جانب داری کی میرے خیال میں نہ صرف کوئی

نظیر موجود نہیں بلکہ یہ تعلیم کے اس مفہوم کے سراسر منافی ہے جو روایتاً مشرق میں رائج ہے۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ کس تیزی کے ساتھ ہمارا تعلیمی نظام پھیل رہا ہے اور ایک قابل اور تعلیم یافتہ آدمی تمام ملک میں کس قدر اچھا یا بُرا اثر ڈال سکتا ہے تو حکومت کے لیئے یہ ایک بہت ہی زبردست اور نتیجہ خیز تجربہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نوجوانوں کی نسلوں کی تعلیم، بعض صورتوں میں بالکل بغیر کسی اور جماعت کی مدد کے، اس طرح کرے کہ اس کا کوئی تعلق ان کے مذہب اور حیات اخروی کے اس احساس سے نہ ہو جس پر وہ اپنے اخلاقی فرائض کی بنیاد رکھتے ہیں اور جوں جوں اس نظام کی توسیع ہوتی جاتی ہے یہ خرابی بڑھتی جا رہی ہے۔"

علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کا ایک مقصدِ اعلیٰ یہ بھی تھا کہ نوجوانوں میں دنیاوی ترقی اور عزت کی خواہش کے ساتھ "حیات اخروی کا یہ احساس" مستحکم کیا جائے تاکہ ان کی زندگی نفسانیت اور جاہ طلبی کے اغراض کے لئے وقف نہ ہو جائے بلکہ وہ اس کو اعلیٰ ترین مقاصد کے لئے جدوجہد میں صرف کرے۔

اس میں شک نہیں کہ مذہبی تعلیم علی گڑھ کی تعلیم کا جزو ہے اور اسی کے اثر سے دوسرے قومی مدارس میں، عام اس سے کہ وہ ہندوؤں کے ہوں یا مسلمانوں کے، مذہبی تعلیم کا کچھ انتظام موجود ہے لیکن جیسا کہ عام اور بجا شکایت ہے تمام ملک میں کہیں بھی یہ انتظام قابلِ اطمینان نہیں اور بالخصوص جو توقعات بانیٔ مدرسۃ العلوم کو اس تعلیمی مرکز سے تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔ ان کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ طلبا کو دن میں چار یا پانچ گھنٹے علوم جدیدہ وغیرہ کی تعلیم ہو اور ایک گھنٹہ وہی فرسودہ قسم کی دینیات پڑھانے میں صرف کیا جائے جو مذہب کو

زندگی کے زبردست موجودہ مسائل کے لئے شاہراہِ ہدایت نہ بنا سکے۔ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ مذہب کو مابعد الطبعیات کی بحثوں اور فقہی مسائل تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس کو عملی طور پر زندگی کے مسائل کو حل کرنے اور مختلف اغراض اور مقاصد کی کش مکش میں سیدھا راستہ نکالنے کے لئے استعمال کیا جائے۔ مولانا حالیؔ ان کے اس خیال سے بحث کرتے ہوئے حیاتِ جاوید میں لکھتے ہیں :

"ان کو اس بات کا احساس ہے کہ انگریزی تعلیم کے مضر اثرات سے مسلمانوں کو بچانا چاہیئے (یعنی الحاد و دہریت سے جو مغرب میں زور پکڑے ہوئے ہیں) اس لئے وہ چاہتے تھے کہ ثابت کریں کہ اسلام موجودہ علوم، فلسفہ حکمت اور سائنس کی ضرب سے ٹوٹ نہیں سکتا۔ بلکہ سچّا اسلام ان کا حامی ہے اور اُن سے اسلام کی حمایت ہوتی ہے۔ مغربی تعلیم کے مخالف اسلام کو کمزور سمجھتے ہیں ورنہ کیوں ڈرتے؟ وہ چاہتے تھے کہ پُرانے علمِ کلام کو ترک کر کے جو علمائے متکلمین نے یونانی فلسفہ کے مقابلہ میں اختیار کیا تھا ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈالیں۔ کیوں کہ موجودہ علم و حکمت پُرانے فلسفہ سے مختلف ہے اور بجائے ظن و تخمین کے تجربہ اور مشاہدہ پر قائم ہے۔ اس کا مقابلہ بھی انھیں ہتھیاروں موافق فطرت دلیلوں اور تشریح و تفسیر سے کرنا چاہیئے۔ وہ پُرانے مولویوں سے بالکل بے اُمید تھے۔ کیوں کہ بقول ان کے "ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یونانی فلسفہ کے علاوہ کوئی اور فلسفہ اور عربی زبان کے علاوہ کوئی اور زبان بھی دنیا میں موجود ہے یا نہیں"۔ علاوہ بریں تقلید کی عادت نے ان کو بالکل قدما کا پابند کر دیا تھا اور طعن و ملامت کے خوف سے وہ کچھ نہیں کرتے۔ وہ آزاد خیالی اور عقلِ انسانی کو زنجیروں سے

آزاد کرنے پر ایمان رکھتے تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ جوں جوں انگریزی تعلیم پھیلے گی مذہب اسلام کی جانب سے بدظنی، بے پروائی، روگردانی پھیلتی جائے گی۔ اس کو دور کرنا اور حال کے علم طبیعی اور فلسفہ کے مسائل کو اسلامی مسائل سے تطبیق دینا یا ان کا بطلان ثابت کرنا ہمارا فرض ہے۔ وہ کہتے تھے کہ قدرت یا فطرت خدا کا فعل ہے اور ہر سچا مذہب اور اس کی کتاب خدا کا قول ہے۔ ان دونوں میں مطابقت ضروری ہے اسی بنا پر انھوں نے اپنی تفسیر لکھی اور اپنے علم کلام کی بنیاد ڈالی۔"

لیکن اس کام کو ان کے بعد نہ علی گڑھ نے کیا، نہ بہت کامیابی کے ساتھ کسی اور جماعت نے انجام دیا۔ حال میں صرف ایک ہی قابل قدر کوشش اس سلسلہ میں کی گئی ہے اور وہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے خطبات ہیں جو SIX LECTURES ON THE RECOSNTRUCTION OF RELIGIOUS PHILOSOPHYIN ISLAM کے نام سے گزشتہ سال شائع ہوئے ہیں مسلم یونیورسٹی صحیح معنوں میں اسلامی خدمت اسی وقت کر سکے گی جب وہ اس اہم کام کو اپنے ذمہ لے اور نہ صرف روح مذہب سے متاثر ہو بلکہ اس کے علما مذہب کے صحیح معنوں اور اس کی صحیح تفسیر کو لوگوں تک پہنچائیں اور اس کو دنیا کے سامنے ایسی روشنی میں پیش کریں کہ وہ انسانی شاہراہ عمل کے لئے شمع ہدایت کا کام دے۔

علی گڑھ کی ایک اور بڑی تعلیمی خدمت یہ ہے کہ اس نے عقلی تعلیم کے ساتھ تربیت سیرت کی ضرورت کو سمجھا اور اس کے لئے ایک معقول ماحول مہیا کرنے کی کوشش کی ہے نظری طور پر تقریباً ہر زمانہ میں تربیت نفس کو تعلیم کا انتہائی نصب العین سمجھا گیا ہے لیکن سرسید کی تعلیمی جدوجہد کے زمانہ میں اس کا کوئی عملی اور معقول انتظام نہ تھا۔ ایک طرف تو

سرکاری مدارس تھے جن کے پیش نظر عملاً اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ اصولاً بھی محض کتابی تعلیم تھی۔ ان کا کام یہ تھا کہ وہ چند مقررہ درسی مضامین کو پڑھائیں اور بس۔ تعمیر سیرت یا عمدہ عادات پیدا کرنے کی کوئی منتظم اور بالارادہ کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر کوئی بہت اچھا اور اثر آفرین معلم ہوتا ہی تو اس کی شخصیت کا اثر اپنا رنگ ضرور لاتا ہے اور ایک حد تک مدرسہ کا معمول اور علمی تعلیم بھی کیرکٹر کی تعمیر اور استحکام میں معین ہوتی ہیں لیکن جب تک تمام نظام تعلیم کو اس مقصد کے لئے نہ ڈھالا جائے کہ طلبار کی نوخیز طبیعتوں میں اعلیٰ اقدار اور عمدہ عادات پیدا ہوں یہ ضمنی فائدے کافی نہیں ہو سکتے پرانے مدارس کے نظام میں اصولاً تربیت کو ایک اہم ترین مقصدِ تعلیم سمجھا جاتا تھا لیکن اس کے لئے مناسب وسائل اور ذرائع مہیا نہیں کئے گئے تھے۔ وہاں بھی تربیت کا عمدہ یا خراب ہونا اساتذہ کی شخصیت پر منحصر تھا۔ اگر حسن اتفاق سے استاد خود علم اور خلوص اور مضبوط سیرت کا مالک ہوتا تو اس کا اثر دھوپ کی روشنی کی طرح خاموشی کے ساتھ طلبار کی زندگی میں سرایت کر جاتا اور ان کی روح اور سیرت کی تاریکیوں کو روشن کر دیتا لیکن بالعموم بقول مولانا حالی کے :

"تربیت کے عام ذرائع ہمارے ہاں تعلیم و تلقین، زجر و توبیخ یا زد و کوب سمجھے جاتے ہیں لیکن دراصل یہ بے کار اور غیر موثر ہیں۔ اس کے لئے ضرورت ہی عمدہ سوسائٹی کے دیرپا اثر کی جو طبیعت میں راہ پائے لیکن عمدہ سوسائٹی عموماً طلبار کے لئے مفقود ہے وہ زیادہ تر بڑوں کی اخلاقی برائیوں کی تقلید کرتے ہیں اور اسکول کو محض تعلیم دینے یعنی لکھانے پڑھانے کی جگہ سمجھا جاتا ہے"۔

ایسی حالت میں، جب کہ ملک کی تمام اخلاقی اور ذہنی زندگی پست اور ناپسندیدہ تھی تعلیم گاہ کے مفہوم اور حلقۂ عمل کو وسیع کرنے کی ضرورت تھی تاکہ وہ صرف "مکتب" ہی کا کام نہ دے بلکہ طلباء کے لئے ایک عمدہ نتیجہ خیز اور دلچسپ ماحول بھی ہو جو ایک اچھے گھر کا فرض ادا کر سکے۔ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک میں یہ خیال کارفرما تھا کہ نوجوانوں کی سیرت کی تشکیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ ایک عمدہ صحت آفریں ماحول میں رہیں۔ جہاں وہ سماجی زندگی بسر کر سکیں، جہاں مل جل کر کھیلنے، کام کرنے، پڑھنے لکھنے کے لئے انتظام ہو اور قوم کی نسلیں اتفاق کے ساتھ، اپنے معلّمین کے زیرِ صحبت نشو ونما پائیں، اکٹھا رہیں سہیں، کھائیں پئیں اور مجموعی اثرات اور روایات کو جذب کریں۔ اس طرح ان میں باہمی محبت، ہمدردی اور قومیت کا احساس پیدا ہو سکتا ہے صحبت کا اثر تعلیم کی جان ہے اور جب یہ صحبت اپنے ہم عمروں اور معلموں دونوں کی ہو۔ جب اس ماحول میں قوم کی بہترین اخلاقی اور روحانی روایات اور اقدار رس بس جائیں، جب اس کی مشترکہ زندگی میں ضبط و انتظام، آزادی اور جدّتِ عمل، پابندی اوقات، سماجی زندگی کی خوبی سے قبول کی ہوئی بندشیں اور معیارِ اخوت او مساوات، کھیلوں اور پڑھنے میں اشتراکِ عمل اور مسابقت سب چیزیں شامل ہوں، تو اس کا اثر بحیثیت مجموعی طالب علم کی سیرت پر نہایت گہرا اور زبردست ہوتا ہے۔ اسی خیال سے سرسیّد نے انگلستان کی قدیم یونیورسٹیوں سے بورڈنگ ہاؤس سسٹم کا خیال لیا اور اس کو ہندوستان میں پہلی مرتبہ ایک بڑے پیمانے پر عملی طور سے جاری کیا۔ یہ طریقہ رفتہ رفتہ ملک میں پھیلتا جاتا ہے اور گزشتہ بیس سال میں جتنی نئی یونیورسٹیاں قائم ہوئی ہیں ان میں سے بیشتر اسی اصول پر قائم ہوئی ہیں کہ ان کا کام محض طلباء کا امتحان لینا نہیں بلکہ ان کے لئے مناسب تربیت کا انتظام کرنا بھی ہے۔ اس امر میں اوّلیت کا شرف

علی گڑھ کو حاصل ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس نظام تربیت کے ذریعہ سے علی گڑھ نے ایک مخصوص "ٹائپ" ہندوستان میں پیدا کیا جس میں خوبیاں بھی ہیں اور نقائص بھی۔ مجھے یہاں اتنا موقع نہیں کہ میں اس سیرت کے تمام نفسی اجزا سے بحث کرکے یہ بتاؤں کہ وہ کیرکٹر کس حد تک مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے لئے مفید ثابت ہوا اور موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے اس میں کس حد تک ترمیم اور اصلاح کی ضرورت ہے لیکن اس بحث کو چھیڑے بغیر بھی یہ امر بالکل واضح ہے کہ ان مقاصد اور اصولوں کو رائج کرنے کے لئے جو تحریک کے پیش نظر تھے یہ نظام تربیت بہت کامیاب ثابت ہوا۔ اور اگر معلّموں کا انتخاب عمدگی سے کیا جائے تو اس سے زیادہ موثر طریقہ تربیت نفس کا ممکن نہیں، کیوں کہ معلّموں کا شخصی اور مجموعی اثر ہی تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

علی گڑھ کی تحریک اور سرسید کے خیالات کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک چند اہم صفات ایسی ہیں جن کو طلبا کی سیرت کا جزو ہونا چاہیئے اور جن کے بغیر شخصیت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ سرسید کے خیال میں اس جدید قومی تعلیم کی علّت غائی اور مقصدِ اعلیٰ یہ تھا کہ وہ قومی اصلاح اور بیداری کا ذریعہ ثابت ہو۔ وہ افراد کو بحیثیت افراد کے تعلیم دینا نہ چاہتے تھے بلکہ بطور ارکین جماعت کے جن کی زندگی اپنے عروج اور کمال کو صرف اسی وقت پہنچ سکتی ہے جب وہ انفرادی قوتوں کو قومی مصالح اور مقاصد کے لئے استعمال کریں ؎

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں ؛ موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

موجودہ نظریۂ تعلیم جو زیادہ تر یورپ اور امریکہ میں گزشتہ پچاس سال کے عرصہ میں مرتب

ہوا ہے، دو مختلف الخیال گروہوں پر مشتمل ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو تعلیم میں شخصیت، انفرادیت، ارتقائے نفس پر زور دیتا ہے اور دوسرا گروہ جماعت، سماجی تعلقات، افراد کی قوتوں کے معاشرتی پہلو اور اتحادِ عمل پر زور دیتا ہے۔ سرسید کے سامنے یہ مسئلہ کبھی اپنی واضح اور علمی صورت میں پیش نہیں تھا لیکن ملک کے حالات اور قومی ضروریات کو دیکھ کر انھوں نے جو نظامِ تربیت مرتب کیا وہ صریحاً ان خیالات پر مبنی تھا جو دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ افراد کا کوئی مجموعہ اس وقت تک "قوم" نہیں بن سکتا جب تک ان میں باہمی ہمدردی، قومی خدمت کے لئے تڑپ، ایثار کا مادّہ اور مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت نہ ہو۔ سرسید اور ان کے دورِ اوّل کے شرکائے کار نے اپنی تحریر و تقریر اور ذاتی مثال کے ذریعہ سے اس بات کو طلبا میں پیدا کرنے کی کوشش کی اور ایک حد تک انھوں نے اس کا اثر قبول بھی کیا یہی وجہ تھی کہ ابتدا میں مسلمانوں کی اکثر قومی تحریکوں کی سرکردگی انھیں لوگوں نے کی جو علی گڑھ سے اس اثر کو لے کر نکلے تھے۔ لیکن بعد میں مختلف وجوہات سے یہ جوش اور میلان کم ہوتا گیا، توجہ سرکاری ملازمتوں اور ذاتی ترقی کی طرف مبذول ہو گئی اور خدمت کا نصب العین جو اسلام نے سکھایا ہے جس کو علی گڑھ نے زندہ کیا تھا اور جو انسانی زندگی کا طغرائے امتیاز ہے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک مسلمانوں میں وہ نظم اور ایثار اور یکجہتی پیدا نہیں ہو سکی جو ان کو ہندوستان کا ایک زبردست اور مفید عنصر بنا سکتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس تحریک کا گہرا اور دیرپا اثر اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اس کے سرگروہ خلوص اور دلیری کے ساتھ اپنی موجودہ حالت کا جائزہ لیں اور اعلیٰ تعلیم اور خدمت قومی کے نصب العین میں دوبارہ ایک مستحکم رشتہ قائم کریں۔

ورنہ نفسانی اغراض اور جد وجہد کا جو طوفان آج کل ہندوستان میں برپا ہے وہ زیادہ خوفناک وخطرناک ہو جائے گا اور قومی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔

اس احساس کے ساتھ ساتھ اس تحریک نے عزتِ نفس پیدا کرنے کی کوشش کی اعتمادِ ذات کے اصول پر زور دیا اور طلبار کو رواداری اور وسعتِ قلب کا سبق پڑھایا۔ بانی مدرسۃ العلوم اس بات پر ضرور مصر تھے کہ مغرب سے مفید چیزیں لی جائیں۔ ان کے نزدیک اس قسم کا لین دین، جو علوم اور معاشرت میں نئی جان ڈال دے باعث ننگ نہ تھا لیکن وہ اس بات کے لئے تیار نہ تھے کہ ہندوستانی اور مسلمان مغرب سے بھیک مانگ کر اپنی زندگی بسر کریں۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ ہر طالب علم میں شخصی اور قومی خودداری بھی پیدا ہو چنانچہ ایک طرف طلبار ایسے کھیلوں اور مشاغل میں حصہ لیتے تھے، سوسائٹیاں اور انجمنیں قائم کرتے تھے جن میں شرکت کرکے ان میں سماجی رکھ رکھاؤ، خوداعتمادی اور صلاحیتِ عمل پیدا ہو کیوں کہ جیسا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں، سیرت کی تعمیر عمل کی کارگاہ ہی میں ممکن ہے، محض زبان اور الفاظ کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتی۔ دوسری طرف وہ ہندوستانی معلّموں اور یوروپین پروفیسروں کے ساتھ مل جل کر رہتے اور اخوت و مساوات کے اصول پر زندگی بسر کرتے تھے۔ اس لئے ان میں سے اکثر میں ایک خودداری اور احساسِ نفس پیدا ہو جاتا تھا اور وہ احساس کمتری جو بدقسمتی سے گزشتہ زمانہ میں ہندوستانی سیرت کا جزو بن گیا ہے بڑی حد تک دُور ہو جاتا تھا۔ یہ بجائے خود ایک بہت قابلِ قدر کامیابی ہے لیکن بدقسمتی سے اس ماحول کا ایک برا اثر یہ ہوا کہ بعض طالب علم مغربی اور مغرب پسند استادوں کی صحبت میں اپنی قومی معاشرت اور تہذیب سے ایک حد تک بیگانہ ہو گئے اور

مغربی تمدن کی سطحی چمک پر فریفتہ ہو کر اس کی اوپری اور اوچھی چیزوں کی تقلید کرنے لگے، اور ان میں اور ملک کی عام زندگی غیر تعلیم یافتہ یا قدیم تعلیم پائے ہوئے طبقوں کی زندگی میں ایک اجنبیت پیدا ہو گئی۔ ان کے خیالات اور جذبات یعنی ان کے مشاغل اور دلچسپیاں، یہاں تک کہ ان کی زبان بھی روشِ عام سے ہٹ گئی لیکن اس کی ذمہ داری بعض حالات پر ہے جن کو مغربی معلمین کی ذات سے کوئی لازمی تعلق نہیں۔ ان میں کچھ حالات مقامی تھے اور کچھ ملکی جواب بڑی حد تک دور ہو گئے ہیں اور اب اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ ہم اس نقص کو دور کر کے، طلبا اور معلمین کے باہمی میل جول سے، مغرب و مشرق کے مناسب امتزاج کی ایک فضا پیدا کریں اور اس میں اس خودداری کی نشو و نما کریں جو تمام اخلاقی خوبیوں کا سرچشمہ اور سیرت کی پختگی کی بنیاد ہے اور جس کے بغیر افراد اپنی شخصیت اور قومیں اپنا عزت و وقار کھو بیٹھتی ہیں۔

رواداری اور وسعتِ قلب کا جو اصول علی گڑھ نے پیش نظر رکھا ہے وہ ہر طرح لائق تعریف ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس تحریک کے ساتھ جس قدر لوگوں کا تعلق آج تک رہا ہے وہ سب تعصب اور تنگ نظری سے پاک تھے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس تعلیم گاہ نے ایک طرف تو تمام اسلامی فرقوں میں اتحاد، یگانگت اور اشتراک عمل پیدا کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف ہندو مسلم تعلقات کو مکمل مساوات اور غیر رواداری کے خوش گوار اصول پر قائم کیا۔ اگر اس ہم آہنگی کو کبھی کبھی کسی ناگوار صورت حال کا مقابلہ کرنا پڑا ہے تو اس کو ان مستثنیات میں شمار کرنا چاہیئے جو بحیثیت مجموعی اصول کی پختگی پر دلالت کرتی ہیں۔ سرسید بذات خود تعصب اور تنگ نظری سے پاک تھے۔ ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ یعنی

سنہ ۱۸۲۷ء سے سنہ ۱۸۷ء تک کا زمانہ ایسی تعلیمی سیاسی اور معاشرتی خدمات میں بسر ہوا تھا جو مسلمانوں کے لئے مخصوص نہ تھیں بلکہ ملکی اور قومی مفاد کو پیش نظر رکھ کر انجام دی گئی تھیں۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کامیابی کے ساتھ اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب دونوں عام معاملات میں مل جل کر، مشترک اغراض اور مقاصد کے لئے کام کریں۔ اسی وجہ سے اُنھوں نے اپنی پبلک زندگی کی ابتدا میں جس قدر کام کئے مثلاً مراد آباد میں اسکول کا قیام غازی پور میں کالج کی ابتدا، سائنٹفک سوسائٹی کا آغاز، تعلیمی کمیٹیوں کے لئے تحریک، ان سب میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے۔ اس کے بعد جب انھوں نے اپنی توجہ کو تمام تر مسلمانوں کی تعلیم اور اصلاح کی طرف پھیر دیا اس وقت بھی اُنھوں نے اپنے بہت سے ہندو دوستوں مثلاً راجہ جے کشن داس اور پروفیسر حکرورتی کو اپنی تحریک میں شریک رکھا اور وہ لوگ اس میں خلوص سے حصّہ لیتے رہے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں ہندو اور مسلمان طالب علموں کو ہمیشہ یکساں حقوق اور مراعات دیئے گئے اور وہ شروع سے اب تک اتفاق اور مساوات کی زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ سنہ ۱۸۸۲ء کے تعلیمی کمیشن نے بہت جوش کے ساتھ کالج کی اس نمایاں خصوصیت پر داد دی ہے اور لکھا ہے:

> "ہم اس کالج کی کمیٹی کو مبارک باد دیتے ہیں کہ ہم نے ہندو اور مسلمان طلبا میں سوائے دوستی کے جذبہ کے اور کچھ نہیں پایا اور ہمیں یقین ہے کہ بحیثیت ایک تعلیم گاہ کے یہ کالج ہندو اور مسلمان طلبا کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔"

علی گڑھ کو اس بات پر بجا طور سے فخر ہو سکتا ہے کہ اس لحاظ سے ہم اُس وقت سے آج تک الزام سے بری، بلکہ شک و شبہ کی پہنچ سے بھی باہر رہے ہیں۔ اگر ہمارے ملک کے

حالات ایسے ہوتے جیسے عام طور پر متمدن انسانوں کے ہونے چاہئیں تو یہ بات ہرگز قابلِ ذکر نہ تھی۔ لیکن اس زمانہ میں جب تعصب اور مذہبی تنگ نظری کا زہر ملک کے اور اداروں سے گزر کر مدرسوں اور کالجوں تک کی فضا کو مسموم کر چکا ہے اس کارنامہ کو علی گڑھ کے روشن ترین کارناموں میں سے شمار کرنا چاہیئے اور ملک کے لئے ایک فالِ نیک سمجھنا چاہیئے۔

اس تحریک کی ایک قابلِ قدر خدمت یہ ہے کہ اس نے ملک میں تربیت جسمانی کی صحیح اہمیت کو پہچنوایا اور مشترک کھیلوں مثلاً کرکٹ، فٹ بال، ہاکی کو رائج کرنے میں نمایاں حصّہ لیا۔ ممکن ہے بادی النظر میں عام لوگوں کو یہ بات غیر اہم معلوم ہو لیکن دراصل یہ ملک کے نوجوان نسلوں کی ایک بہت بڑی خدمت تھی جس کی قدر و قیمت کا انھیں صحیح اندازہ نہیں۔ ریاضتِ جسمانی کا تعلق صرف جسم کی نشو و نما ہی سے نہیں بلکہ دماغی تربیت اور اخلاق و سیرت کی تشکیل میں بھی اس کو بڑا دخل ہے۔ اگر دماغوں کو عقل کی روشنی سے منور کرنا اور روح کو اخلاقِ الٰہی سے متصف کرنا ہے تو جسم کو، جو روح اور دماغ کا گھر ہے اس بارِ عظیم کو اٹھانے کا اہل بنانا ضروری ہے۔ جس زمانے میں مدرستہ العلوم قائم کیا گیا ہے لوگ عام طور پر کھیلوں کو مہمل یا مضر یا کم از کم غیر ضروری خیال کرتے تھے۔ شرفا کی اولاد پرانی قسم کے ورزشی کھیلوں اور ریاضت کو بھولتی جاتی تھی اور ان کے بجائے کوئی معقول بدل موجود نہ تھا۔ مروجہ مدارس میں ان کو جاری کرنے کا خیال مولویوں اور پنڈتوں اور دقیانوسی استادوں کے ذہن میں داخل نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ ان کی طبیعت کی جولانی محض اس حد تک تھی کہ وہ ہر نئی چیز کو بدعت قرار دے کر اس کے خلاف کوئی نام نہاد "مذہبی" دلیل پیش کر دیں۔ سرکاری مدارس میں کہیں کہیں کھیلوں کو جاری کیا گیا تھا لیکن وہاں بھی

اُستادوں کو والدین کی مخالفت سے سابقہ پڑتا تھا اور وہ کھیل ملک میں پھیلتے نہ تھے۔ علی گڑھ کی تحریک نے ان کو فروغ دیا اور پھیلایا اور ان کے ذریعے سے ایک حد تک چستی چالاکی مستعدی، جفاکشی، ہمت، حوصلہ اور بیداری کی صفات پیدا کیں جو اس زمانہ میں قومی سیرت سے مفقود ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ اس کا ایک مقصد یہ تھا کہ اس تعلیم گاہ میں ایسے نوجوانوں کو تیار کیا جائے جن میں قوت ہو، جن کی جسمانی نشو و نما مکمل ہوئی ہو، جن کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑتا پھرے، جو باوجود طالب علم ہونے کے، مدقوق اور کتاب کے کیڑے معلوم نہ ہوں (جیسے اکثر نوجوان اسکولوں اور کالجوں اور امتحانوں کی آزمائش میں سے گزرنے کے بعد ہو جاتے تھے اور بدقسمتی سے اب تک ہوتے ہیں) جو علی گڑھ کی اصطلاح میں "کھلنڈرے" ہوں۔ اگرچہ ملک کی جسمانی تربیت کا مسئلہ ابھی خاطر خواہ طے نہیں ہوا اور گزشتہ بیس سال میں بعض تعلیم گاہوں نے علی گڑھ سے بہتر جسمانی نشو و نما کا انتظام کر دکھایا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس راستہ میں علی گڑھ نے چراغِ ہدایت کا کام کیا۔

اس تحریک کی ایک آخری اور نہایت اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہ وسیع ترین معنوں میں "تعلیمی تحریک" تھی یعنی اس کا تعلق محض لکھانے پڑھانے یا علوم سکھانے سے نہیں تھا بلکہ اس کا منشا یہ تھا کہ مسلمانوں میں ایک عام ذہنی بیداری پیدا کی جائے، ان کی معاشرت اور تمدن میں ضروری اصلاح کی جائے، ان میں قومیت اور یک جہتی کا احساس پیدا کیا جائے تاکہ وہ اپنے مخصوص اصول و روایات اور اپنے بلند نصب العین کا دامن مضبوط تھام کر اپنی دنیاوی وجاہت اور عزت کو دوبارہ حاصل کریں۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں اس تحریک کا ایک مظہر مدرستہ العلوم تھا وہاں اس کے ساتھ ساتھ بانیِ کالج قومی ترقی اور اصلاح کے لئے اور

بہت سے وسائل کو کام میں لا رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنی تفسیر اور مذہبی تصانیف کے ذریعہ مذہب کے متعلق غلط فہمیوں کو اور اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ تمدنی اور معاشرتی زندگی کی خرابیوں کو دُور کرنے کی کوشش کی۔ تہذیب الاخلاق اور علی گڑھ گزٹ کو اُنھوں نے نہ صرف اپنے دُور اندیش اور انقلابی خیالات کا ترجمان بنایا بلکہ ان کے ذریعہ سے اُردو اخبار نویسی اور رسائل کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور اُردو طرز تحریر میں ایک نئی شاہراہ نکالی جو بہت زیادہ موافق فطرت تھی اور ان نئے علوم اور خیالات کی حامل ہو سکتی تھی جو زیادہ تر انھیں کی کوششوں سے اس زبان میں منتقل ہو رہے تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ ان تمام اصلاحی امور کی سرکردگی کا مرکز یہی تعلیم گاہ ہو اور اس کے ذریعے سے مسلمانوں میں ایک نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیا جائے۔ اس مقصد میں کالج کی امداد اور پشت پناہی کے لئے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد بھی ڈالی گئی اور اس کے اغراض و مقاصد میں نشر و اشاعت تعلیم، اصلاح معاشرت، مذہبی تعلیم اور علوم مشرقی کا تحفظ، مذہبی مدارس کی نگرانی اور اصلاح وغیرہ کو شامل کیا گیا۔ اس لئے ہم اس تحریک کا اصل مفہوم اور اس کی پوری اہمیت اس وقت تک نہیں جان سکتے جب تک ہم ان تمام شعبوں کو ذہن میں نہ رکھیں اور یہ نہ سمجھیں کہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کا مقصد مسلمانوں کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنی قومی خودی حاصل کر کے اپنے وطن کے بہترین اور مفید ترین شہری بن سکیں۔ تحریک کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ اس کو قومی زندگی کی کش مکش اور زندہ مسائل کی جد و جہد سے بچا کر ایک شیشہ کے گھر میں نشو و نما دی جائے جس طرح بعض حرارت پسند پودوں کو گرم خانوں میں محفوظ رکھا جاتا ہے! اگر یونیورسٹی کی علمی زندگی کو قومی ضروریات، قومی مفاد اور

حیاتِ قومی کے مسائل سے بُعد پیدا ہو گیا، اگر ان دونوں کے درمیان جو رشتہ اور رابطہ ہونا چاہیئے وہ ٹوٹ گیا، تو اس میں سے وہ حرکت اور زندگی بخشنے والا عنصر مفقود ہو جائے گا جو تعلیم کو بجائے فرسودہ مضامین پڑھانے تک محدود کرنے کے، حیاتِ برتر کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے۔ میں نے ابتدائے مضمون میں ذکر کیا ہے کہ تعلیم اور زندگی کے اس وسیع تعلق کو سمجھنا ضروری ہے اور اس کے مطابق تعلیم میں اصلاح اور تبدیلی کرنی لازمی۔ کیونکہ یہ زندگی جو "کبھی جان اور کبھی تسلیمِ جاں" جو "برتر از اندیشۂ سود و زیاں" جو "جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں" ہے آئے دن نئے نئے مسائل تعلیم کے سامنے پیش کرتی رہتی ہے۔ ان مسائل کا مردانہ وار مقابلہ کرنا اور ان کو حل کرنے کی تدابیر سوچنا تحریک کے سرگروہوں کا فرض ہے، اُن سے پہلو بچانا یا گریز کرنا صداقت اور جرأت کے اس نصب العین کی خیانت ہوگی جس پر تحریک کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

(۴)

مضمون کے آخر میں، میں چاہتا ہوں کہ اس تحریک کے ایک کمزور پہلو کی طرف آپ کی توجہ کو مبذول کروں، یعنی اس تحریک کا تعلق فنِ تعلیم سے۔ وسیع معنوں میں "تعلیم" کی جو خدمت سرسید اور علی گڑھ نے کی، اس کے مختلف پہلوؤں پر میں اظہارِ خیال اور اس کی عظمت کا اعتراف کر چکا ہوں لیکن ایک غیر جانبدار نقاد کو یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ علی گڑھ نے ملک کی تعلیم کے مسئلہ پر فنی نقطۂ نظر سے نہ کبھی غور کیا نہ اس میں کوئی معتدبہ اضافہ یا ترمیم کی۔ بحیثیت مجموعی اس نے نصاب اور تعلیم وغیرہ کے مسائل میں مدرسہ اور کالج دونوں میں مروّجہ، ناقابلِ اطمینان نمونوں کی پیروی کی اور اصلاحِ نصاب، ذریعۂ تعلیم

منہاج تعلیم وغیرہ کے اہم معاملات میں بجائے اجتہاد وفکر سے کام لینے کے سرکاری یونیورسٹیوں کی تقلید کی اور ملک کی مخصوص اور ارتقا پذیر ضروریات کے مطابق ان میں ترمیم اور تبدیلی ضروری نہیں سمجھی۔ مولانا حالی نے، جن کی دقتِ نظر اور نکتہ شناسی کی جس قدر داد دی جائے کم ہے، اب سے تیس برس پہلے اس پہلو کی کمزوری کو محسوس کیا تھا اور حیاتِ جاوید میں لکھا تھا:۔

"نفس تعلیم یعنی طلبار کے معیار قابلیت اور علمی لیاقت کے لحاظ سے اس کالج کو دوسرے کالجوں پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ کیوں کہ یہ سب ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں اور یونیورسٹیوں کے دست نگر ہیں اور اس کی تعلیم دینے پر مجبور ؎

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

اس لئے وہاں موجد، مخترع اور محقق پیدا نہیں ہوتے۔"

اگرچہ ان الفاظ کو لکھے ایک زمانہ گزر گیا اور دس سال سے زیادہ ہوئے ہماری اپنی یونیورسٹی بھی قائم ہو گئی لیکن میرے خیال میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ الفاظ اِس وقت بھی اتنے ہی صحیح ہیں جس قدر اُس وقت تھے اور اب تک اس حالت میں کوئی نمایاں ترقی یا بہتری نہیں ہوئی۔ اب بھی ہم کو تعلیمی معیار کے لحاظ سے دوسری یونیورسٹیوں پر کوئی خاص فوقیت حاصل نہیں بلکہ بعض ادنیٰ معیاروں مثلاً مقابلہ کے امتحانات میں کامیابی کے لحاظ سے ہمارے طلبار چند یونیورسٹیوں کے طلبار سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس صورتِ حال کے بہت سے تاریخی اسباب ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں اور جن کو پیش نظر رکھ کر ہم تحریک کے ابتدائی سرگروہوں کو سوائے اس کے اور کوئی الزام نہیں دے سکتے

کہ ان کا تخیل اپنے زمانہ اور اپنے ہم عصروں کے منتہائے نظر سے بہت زیادہ وسیع اور دور رس تھا علاوہ بریں اس مسئلہ کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کرنے سے پہلے ہم کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ سرسید اصطلاحی معنوں میں ماہر تعلیم نہ تھے۔ انھوں نے فن تعلیم کا بحیثیت ایک فن کے مطالعہ نہ کیا تھا۔ وہ ایک مدبر تھے اور وسیع معنوں میں قوم کے تعلیمی رہنما ان کو زیادہ تر نظم ونسق اور تعلیمی پالسی کے عام مسائل سے واقفیت اور دلچسپی تھی اور ان کا خاص مطمح نظر یہ تھا کہ مسلمان نوجوانوں کی سیرت کی تشکیل کریں اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس میدان میں انھوں نے کس قدر نمایاں کامیابی حاصل کی۔ مگر جس وقت انھوں نے تحریک کی ابتدا کی تھی تعلیم کے فنی رخ پر، خصوصاً یونیورسٹی کی تعلیم پر، ہندوستان میں کیا کہیں بھی منتظم طریقہ سے غور اور علمی تحقیقات نہیں ہو رہی تھیں۔ فن تعلیم کی حیرت انگیز ترقی اور تدوین اور اس میں ماہرین کا شغف اور انہماک مقابلۃً حال کی بات ہے۔ اس لئے یہ بات ہماری سمجھ میں آسکتی ہے کہ جب سرسید نے قومی تعلیم کا نظام قائم کرنا چاہا تو انھوں نے اپنے تجربہ اور واقفیت کی بنا پر یہ فیصلہ کیا کہ علوم مشرقی اور مذہبی تعلیم کا انتظام کرنے کے بعد، اور سب لحاظ سے آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں کا نمونہ ہر طرح ہمارے لئے قابل تقلید ہے اور ہمیں اسی نمونہ پر اپنے نظم ونسق اور طریقۂ تعلیم کو ڈھالنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اپنی تحریروں اور تقریروں میں اور ان کے تمام جانشینوں کے خیالات میں ہم بار بار یہی آکسفورڈ اور کیمبرج کے سُر کا اعادہ پاتے ہیں۔ اگر اس شعر کے تکرار کی اجازت ہو تو دوبارہ یہی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ :؎

درپسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند ؛ آنچہ استادِ ازل گفت ہمیں می گویم!

لیکن اس تعلیم کے محدود فوائد کو مانتے ہوئے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ مختلف وجوہات سے یہ خیال نہ صرف غلط بلکہ ایک حد تک گمراہ کن ثابت ہوا۔ اول تو یہ نقطۂ نظر اصولاً غلط ہے کہ ہم کسی غیر ملکی نظام یا ادارہ کو تمام و کمال قابلِ تقلید سمجھ لیا جائے، بالخصوص تعلیم کے میدان میں ایسا کرنا خطرناک ہے۔ کیوں کہ اس میں تو ہر چیز قومی خصائص، قومی ضروریات اور قومی نصب العین کے ماتحت قدرتی طور پر نشو و نما پاتی ہے۔ یہ پودا ایسا نہیں کہ ایک سرزمین سے اکھاڑ کر اس کو ایک بالکل مختلف ماحول میں جوں کا توں لگا دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ سرسید نے یہ قابلِ قدر خیال ملک کے سامنے پیش کیا کہ ہمیں خود اپنی قومی روایات کے مطابق اپنی تعلیم کا انتظام کرنا چاہیئے لیکن شبلی اور بہت سے بڑے بڑے صاحبانِ فکر کے ان کی اصل کامیابی اس خیال کو پیش کرنے تک محدود تھی، اس کو عمل میں لانا، اور تعلیم کی جزئیات تک میں اس کا خیال رکھنا ان کے بس کی بات نہ تھی یہ فرض ان کے پس رو حضرات کا تھا۔ لیکن وہ بھول گئے کہ "تجلّیِ دگرے درخورِ تقاضا نیست" اور اسی قائم شدہ اسلوب پہ چلتے رہے۔

دوسرے اپنے مقامی اور مالی حالات کی وجہ سے ہم ان یونیورسٹیوں کی پوری تقلید بھی نہیں کر سکے۔ بارہا کوشش کی گئی کہ علی گڑھ میں فیلوشپ اور ریسرچ وغیرہ کے لئے انتظامات کئے جائیں لیکن اس کے لئے پروفیسروں کی فراہمی، کتب خانہ کی تکمیل، معملوں کے قیام اور وظائف وغیرہ کی ضرورت تھی اور اس کے واسطے کافی سرمایہ فراہم نہیں ہو سکا۔ لہٰذا ہماری تقلید زیادہ تر سطحی امور تک محدود رہی۔ ہم میں اور ان میں سطحی مشابہت تو پیدا ہو گئی لیکن وہاں کی وہ فضا جس کو تاریخی روایات، علمی

انجمنوں کی کارگزاریوں اور تموّل نے ایک خاص تہذیب کا گہوارہ بنا دیا تھا۔ یہاں پیدا نہیں ہو سکی۔

تیسرا اور سب سے بڑا اور قابلِ غور اعتراض مجھ کو یہ ہے کہ تعلیم کا جو مقصد اور مطمحِ نظر ان قرونِ وسطیٰ کی تعلیم گاہوں کے پیشِ نظر تھا وہ اُس زمانہ کے لئے بھی ناموزوں تھا اور اس زمانہ کی ضروریات کے ساتھ تو بالکل ہم آہنگ نہیں۔ ان کے نظامِ تعلیم میں عام طلبا کے لئے ذہنی نشو و نما، علمی تجسس اور تحقیق کو کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں تھی اگرچہ قابل معلمین کی موجودگی کی وجہ سے اکثر طالب علم بہت قابل ہو کر نکلتے تھے۔ ان کا منشا در اصل شرفا اور متموّل طبقے کی تعلیم تھا جس کی خصوصیات کو GENTLEMANLY EDUCATION. کی اصطلاح سے ظاہر کیا جا سکتا ہے یعنی ایسے خوش حال، خوش پوش اور خود پسند شرفا پیدا کرنا جو عرفِ عام کے مطابق پڑھے لکھے ہوں، جن کی جسمانی صحت اور نشو و نما اچھی ہو، جو سماجی اور سیاسی زندگی میں حصہ لے سکیں اور قومی اور ملکی معاملات کی سرکردگی کریں، وہ سرکردگی جو ان کو اپنے مخصوص حالات اور حیثیت کی وجہ سے تقریباً خود بخود حاصل ہو جاتی تھی۔ یہ نصب العین اس زمانہ میں ترتیب دیا گیا تھا جب تعلیم زیادہ تر دولت مند اور متوسط طبقوں تک محدود تھی، زندگی میں سکون اور قیام زیادہ تھا، جماعتوں کی تقسیم بہت کچھ مستقل تھی، غریب اور امیر "اپنی اپنی جگہ" اور خدا کی کائنات میں اپنی اپنی اضافی اہمیت جانتے تھے۔ لوگوں کی زندگی اور کاروبار زیادہ تر مقررہ شاہراہوں پر چلتے تھے۔ بقول ایک انگریزی قدامت پسند کے:

"خدا اپنے تختِ حکومت پر متمکن تھا اور دنیا میں امن او چین کا دور دورہ تھا"

لیکن گزشتہ پچاس سال میں یہ حالات بالکل تبدیل ہو چکے ہیں۔ مغربی ممالک میں سیاسی اور صنعتی انقلابوں نے پرانے انتظامات اور اداروں کو درہم و برہم کر دیا ہے اور حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ہر ہر شعبۂ زندگی میں تبدیلیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ہندوستان بھی ان عالمگیر اثرات سے محفوظ نہیں رہا۔ یہاں بھی ملک اور قوم کی زندگی کا ماحول بہت کچھ بدل چکا ہے اور روز بروز بدلتا چلا جاتا ہے اور ہم ہرگز اپنے پرانے نظام تعلیم پر قانع ہو کر نہیں بیٹھ سکتے مغرب میں خود انگلستان میں جو ہمارے لئے سرچشمۂ ہدایت بنا ہوا ہے تعلیم میں انقلاب آفریں تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ آکسفورڈ اور کیمبرج، جن میں سے ایک "ناکامیاب تحریکوں کا گھر" کہا جاتا ہے ان خیالات سے متاثر ہو کر اپنے صدیوں کے نظام میں ترمیم کر چکے ہیں اور ان کے علاوہ اور بہت سی نئی یونیورسٹیاں قائم ہو گئی ہیں جو ان نئے طبقوں اور جماعتوں کے لئے مناسب تعلیم مہیا کرتی ہیں جن کو زمانۂ حال کے انقلابات نے ایک زبردست اور خود آشنا قوت بنا دیا ہے۔ علاوہ بریں اگر انگلستان میں اس قسم کی دو یونیورسٹیاں موجود ہیں تو اس کے لئے سند جواز مل سکتی ہے۔ انگریزوں نے دنیا میں اپنے لئے ایک عظیم الشان مملکت پیدا کر لی ہے اور اس پر حکومت کرنے کے لئے ان کو ایک ایسے تعلیم یافتہ گروہ کی ضرورت محسوس ہوئی جو بعض خاص صفات اور خصوصیات کا مالک ہو، جو اپنے کو دنیا کے دوسروں لوگوں سے برتر اور ممتاز سمجھے، جس کو اپنے تہذیبی مشن پر اعتقاد اور حسنِ ظن ہو، جس میں احساس کے بجائے قوت، تخیل کے بجائے استقلال، علمی تبحر اور تنقید کے بجائے ادّعا اور خود پسندی اور ہمدردی کے بجائے اپنے مقررکردہ فرض پر اصرار کی صلاحیت ہو۔ یہ سچ ہے کہ جیسا برٹرنڈ رسل نے اپنی قابلِ غور کتاب "تعلیم" میں لکھا ہے یہی صفات جو شاید ایک طرف سلطنتِ برطانیہ کی تعمیر میں

مفید ثابت ہوئی تھیں۔ دوسری طرف اس سلطنت کو آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر ان کے ہاتھوں سے چھین رہی ہیں لیکن یہ بعد کا تجربہ ہے۔ ابتدا میں یہ یونیورسٹیاں جو کیرکٹر کی مضبوطی کو انسانی جذبات اور علمی تنقید پر ترجیح دیتی ہیں ایک واضح مقصد میں معین تھیں۔ البتہ ہندوستان میں جو ایک غریب ملک ہے جو ایک جاہل اور غلام ملک ہے، جس کے مسائل اقلیم رانی سے نہیں، حصول معاش اور اصلاح معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسی تعلیم گاہوں کے لئے جو محض "شرفا کی تعلیم" تک اپنے کو محدود رکھیں کوئی جگہ نہیں۔ اس زمانہ میں زیادہ جد وجہد، زیادہ حرکت، زیادہ ذہنی اجتہاد اور علمی تحقیق، زیادہ عملیت کی ضرورت ہے۔ سرسید کے زمانہ میں ہر مسلمان جو بی اے پاس کر لیتا تھا ملک میں ممتاز سمجھا جاتا تھا عام اس سے کہ اس میں کوئی علمی قابلیت ہو یا نہ ہو۔ اس کو آسانی سے عمدہ سرکاری ملازمت مل جاتی تھی۔ اس کو کشمکش حیات سے سابقہ نہ پڑتا تھا لیکن اب یہ بات ممکن نہیں، اب حالات اس امر کے مقتضی ہیں کہ علی گڑھ نفس تعلیم کی طرف متوجہ ہو اور اس مسئلہ پر غور کرے کہ اس تگ و دو اور جد وجہد کے زمانہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کو ملک میں باعزت اور مفید زندگی بسر کرنے کے لئے کس قسم کی تعلیم درکار ہے۔ عالمگیر انقلابات نے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے بعض اقتصادی ہیں، بعض سیاسی اور بعض ذہنی، ہندوستان کے ماحول کو بہت کچھ بدل دیا ہے۔ سرسید کے زمانہ میں تعلیم کا مسئلہ مقابلۃً سہل اور سادہ تھا۔ لوگوں اور جماعتوں کی جگہیں مقرر تھیں اور ہر شخص اپنی مقررہ حدود میں رہتا تھا اور اپنے محدود حلقے مشاغل کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ لیکن سیاسی اور معاشرتی جمہوریت کے اثر نے سکون و اطمینان کا وہ مرقع حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے اور تعلیم کا مسئلہ بہت زیادہ وسیع، بہت زیادہ پیچیدہ اور بہت زیادہ مختلف ہو گیا ہے۔ اب ہر طبقہ اور ہر جماعت کو تعلیم دینے کی ضرورت ہے

اور وہ تعلیم ایسی ہونی چاہیئے کہ ان سب کی مختلف النوع ضروریات کی کفیل ہو سکے۔ اسے جہاں بعض لوگوں کو دستکاری کے لئے تیار کرنا ہے، وہاں بعض کو اعلیٰ ترین علمی تحقیقات کے قابل بنانا ہے۔ اسے عوام میں ضبطِ نفس اور قومی نظم کی روح پیدا کرنی ہے اور اہلیت رکھنے والوں میں سرداری اور قیادت کی صفات کو فروغ دینا ہے۔ اسے تمام قوم کے معیار اقدار میں انقلاب پیدا کرنا ہے تاکہ دولت اور محنت اور سماجی تعلقات کے متعلق جو گمراہ کن اور فساد انگیز خیالات ان میں راہ پا گئے ہیں ان کی بیخ کنی ہو۔ اور وہ محنت کی عظمت، انسانی شخصیت کے احترام اور دولت کے صحیح مصرف کو پہچانیں۔ یونیورسٹیوں کے لئے اب یہ ممکن نہیں کہ وہ عوام الناس کے جذبات اور خیالات اور ان کی ضروریات سے بیگانہ ہو کر، محض متمول طبقوں کے چند فرصت نصیب نوجوانوں کو چند دل خوش کن مضامین اور آدابِ نشست و برخاست کی تعلیم دے کر اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جائیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی کو مثل دیگر زندہ یونیورسٹیوں کے اب ان مسائل کو حل کرنے اور نئے راستے نکالنے کی ضرورت ہے۔ اسے علمی تحقیقات اور اجتہادِ فکر کے ذریعہ نہ صرف دنیا میں علمی وقار حاصل کرنا ہے بلکہ فطرت کی قوتوں کو تسخیر کر کے ان کو زندگی کا خادم اور آلہ کار بنانا ہے۔ موجد، محقق اور مخترع پیدا کرنے ہیں جو دنیائے خیال اور دنیائے عمل دونوں میں اپنا سکہ بٹھا سکیں۔ موجودہ زمانہ میں کوئی یونیورسٹی اپنی علمی حیثیت قائم نہیں کر سکتی جو اس صلائے عمل کو فراموش کر کے محض معمولی درس و تدریس اور اسناد کی تقسیم پر قانع رہے۔

اس مضمون کی حدود میں یہ ممکن نہیں کہ میں ان تمام مسائل کا سرسری طور پر بھی احاطہ کر سکوں جن سے مسلم یونیورسٹی کو مستقبل قریب میں سابقہ پڑنے والا ہے۔ میں نے صرف یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ حالات کی تبدیلی کی وجہ سے ہمیں تعلیم کے مقاصد اور ذرائع کا تنقیدی

نظر سے جائزہ لینا پڑے گا اور ہندوستان کے مسلمانوں کی آئندہ ترقی کا انحصار بہت کچھ اس امر پر ہے کہ علی گڑھ کے ماہرین تعلیم کس حد تک کامیابی کے ساتھ اس مہم سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔
گزشتہ زمانہ میں تاریخی اور معاشرتی وجوہات سے، گزشتہ دس سال میں مقامی حالات کی وجہ سے علی گڑھ اس طرف توجہ نہیں کر سکا اس اہم ترین فرض کی ادائگی کا بار اس پر ہے۔ اب جب کہ صدر کانفرنس یعنی یونیورسٹی کے موجودہ وائس چانسلر عالی جناب ڈاکٹر سید راس مسعود صاحب کے عہد میں ان امور کی طرف توجہ ہونی شروع ہوئی ہے ہم توقع کر سکتے ہیں کہ علی گڑھ مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ پر از سر نو غور کرے گا اور ایک ایسا لائحہ عمل اختیار کرے گا جو محض خوشحال شرفا ہی کی نہیں بلکہ تمام قوم کی تعلیم کے لئے مناسب اور موزوں ہو۔ اس سعی مشکور میں ہم کو اغیار اور غیر ملکیوں کی ذہنی غلامی سے آزاد ہو کر، خود اپنے قومی جوہر طبع GENIVE. کے بہترین عناصر پر قومی تعلیم کی عمارت کو تعمیر کرنا چاہیئے اور راستہ کی تمام صعوبتوں اور دشواریوں کو مردانہ وار برداشت کر کے قوم کو دوبارہ آشنائے ذوقِ حیات کرنا چاہیئے۔

قبائے زندگانی چاک تاکے
چو موراں آشیاں در خاک تاکے
بہ پرواز آ و شاہینی بیاموز
تلاشِ دانہ در خاشاک تاکے
(اقبال)

خواجہ غلام السیدین

۱۹۱۸

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوئی ۱۳۴۹ھ ۱۹۳۱ء